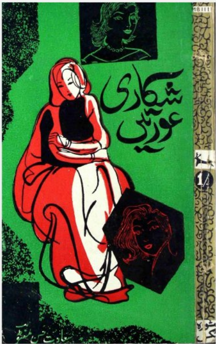
شکاری عورتیں

شکاری عورتیں

افسانے

سعادت حسن منٹو

قیمت فی کتاب ایک روپیہ

جملہ حقوق محفوظ ہیں

ناشران:- مشورہ بکڈپو
رام نگر گاندھی نگر۔ پوسٹ بکس ۱۶۳۹ دہلی ۶

مطبوعہ - دلی پرنٹنگ ورکس دہلی

HAKARI AURATAIN : SAADAT HASSAN MANTO
STORIES

ہکاری عورتیں

سعادت حسن منٹو

مشورہ بکڈپو رام نگر گاندھی نگر پوسٹ بکس ۱۶۳۹ دہلی ۶

"رحمتِ خداوندی کے پھول"!

زمیندار اخبار میں جب ڈاکٹر راتھر پر رحمتِ خداوندی کے پھول برستے تھے تو یار دوستوں نے غلام رسول کا نام ڈاکٹر راتھر رکھ دیا تھا۔ معلوم نہیں کیوں، اس لئے کہ غلام رسول کو ڈاکٹر راتھر سے کوئی نسبت نہیں تھی اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایم بی بی ایس میں تین بار فیل ہو چکا تھا۔ مگر کہاں ڈاکٹر راتھر، کہاں غلام رسول۔

ڈاکٹر راتھر ایک اشتہاری ڈاکٹر تھا جو اشتہاروں کے ذریعے سے قوت مردمی کی دوائیں بیچتا تھا۔ خدا اور رسول کی قسمیں کھا کھا کر اپنی دواؤں کو مجرب بتاتا تھا۔ اور یوں سینکڑوں روپے کماتا تھا۔ غلام رسول کو ایسی دواؤں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ شادی شدہ تھا، اور اس کو قوتِ مردمی بڑھانے والی چیزوں کی کوئی حاجت نہیں تھی۔ لیکن پھر بھی اس کے یار دوست اس کو ڈاکٹر راتھر کہتے تھے۔ اس کایا کلپ کو اس نے تسلیم کر لیا تھا۔ اس لئے کہ اس کے علاوہ کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔ اس کے دوستوں کو یہ نام پسند آ گیا تھا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ غلام رسول کے مقابلے میں ڈاکٹر راتھر کہیں زیادہ موڈرن ہے۔

اب غلام رسول کو ڈاکٹر راتھر ہی کے نام سے یاد کیا جائے گا۔ اس لئے کہ زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھنا چاہیئے۔

ڈاکٹر راتھر میں بے شمار خوبیاں تھیں۔ سب سے بڑی خوبی اس میں یہ تھی کہ وہ ڈاکٹر نہیں تھا۔ ورنہ بننا چاہتا تھا۔ وہ ایک اطاعت مند بیٹے کی طرح اپنے ماں باپ کی خواہش کے مطابق میڈیکل کالج میں پڑھتا تھا۔ اتنے عرصے سے کہ اب کالج کی عمارت اس کی زندگی کا ایک جزو بن گئی تھی۔ وہ یہ سمجھنے لگا تھا کہ کالج اس کے کسی بزرگ کا گھر ہے جہاں اس کو ہر روز سلام عرض کرنے کے لئے جانا پڑتا ہے۔

اس کے والدین مصر تھے کہ وہ ڈاکٹری پاس کرے۔ اس کے والدین کو یقین تھا کہ وہ ایک کامیاب ڈاکٹر کی صلاحیتیں رکھتا ہے۔ اپنے بڑے لڑکے کے متعلق مولوی سراج الدین نے اپنی بیوی سے پیش گوئی کی تھی کہ وہ بیرسٹر ہوگا، چنانچہ جب اس کو ایف۔ ایل۔ بی پاس کرا کے لندن بھیجا گیا تو وہ بیرسٹر بن کر ہی آیا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ اس کی پریکٹس دوسرے بیرسٹروں کے مقابلے میں بہت ہی کم تھی۔

گو ڈاکٹر راتھر تین مرتبہ ایم بی بی ایس کے امتحان میں فیل ہو چکا تھا مگر اس کے باپ کو یقین تھا کہ وہ انجام کار بہت بڑا ڈاکٹر بنے گا اور ڈاکٹر راتھر اپنے باپ کا اس قدر فرماں بردار تھا کہ اس کو بھی یقین تھا کہ

ایک روز وہ لنڈن کے ہارلے اسٹریٹ میں بیٹھا ہوگا اور اس کی ساری دُنیا میں دھوم مچی ہوگی۔

ڈاکٹر راتھر میں بے شمار خوبیاں تھیں۔ ایک خوبی یہ بھی تھی کہ سادہ لوح تھا۔ لیکن سب سے بڑی بُرائی اس میں یہ تھی کہ پیتا تھا اور اکیلا پیتا تھا۔ شروع شروع میں تو اُس نے بہت کوشش کی کہ اپنے ساتھ کسی اور کو نہ ملائے لیکن یار دوستوں نے اُس کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ ان کو اُس کا ٹھکانہ معلوم ہوگیا۔ سیوائے بار میں شام کو سات بجے پہونچ جاتے تھے۔ مجبوراً ڈاکٹر راتھر کو انہیں اپنے ساتھ پلانی پڑتی۔ یہ لوگ اُس کا گن گاتے' اُس کے مستقبل کے متعلق بڑی حوصلہ افزا باتیں کرتے۔ راتھر نشے کی ترنگ میں بہت خوش ہوتا۔ اور اپنی جیب خالی کر دیتا۔

پانچ' چھ مہینے اسی طرح گذر گئے۔ اُس کو اپنے باپ سے دو سو روپے ماہوار ملتے تھے۔ رہنا الگ تھا۔ مکان کا کرایہ بیس روپے ماہانہ تھا۔ دن اچھے تھے۔ ورنہ راتھر کی بیوی کو فاقے کھینچنے پڑتے۔ لیکن پھر بھی اُس کا ہاتھ تنگ ہوگیا۔ اس لئے کہ راتھر کو دوسروں کو پلانا پڑتی تھی۔

ان دنوں شراب بہت سستی تھی۔ آٹھ روپیہ کی ایک بوتل۔ ادھا چار روپے آٹھ آنے میں ملتا تھا۔ گر ہر روز ایک ادھا لیتا۔ یہ ڈاکٹر راتھر کی بساط سے باہر تھا۔ اس نے سوچا کہ گھر میں پیا کرے۔ مگر یہ کیسے ممکن تھا۔ اس کی بیوی کو فوراً اطلاع ہو جاتی۔ اس کو معلوم ہی نہیں تھا کہ اُس کا خاوند شراب کا عادی ہے۔ اس کے علاوہ اُس کو شرابیوں سے سخت

نفرت تھی۔ نفرت ہی نہیں' ان سے بہت خوف آتا تھا۔ کسی کی سُرخ آنکھیں دیکھتی تو ڈر جاتی "ہائے' ڈاکٹر صاحب' کتنی ڈراونی آنکھیں تھیں۔ اس آدمی کی ۔ ایسا لگتا تھا کہ شرابی ہے"

اور ڈاکٹر راتھر دل ہی دل میں سوچتا کہ اُس کی آنکھیں کیسی ہیں' کیا پی کر آنکھوں میں سُرخ ڈورے آتے ہیں ؟ ۔ کیا اُس کی بیوی کو اُس کی آنکھیں ابھی تک سُرخ نظر نہیں آتیں ؟ ۔ کب تک اُس کا راز راز رہے گا ؟ ۔ منہ سے بُو تو ضرور آتی ہوگی۔ کیا وجہ ہے کہ اس کی بیوی نے کبھی نہیں سونگھی۔ پھر وہ یہ سوچتا "نہیں' میں بہت احتیاط برتتا ہوں۔ میں نے ہمیشہ منہ پرے کر کے اُس سے بات کی ہے۔ ایک دفعہ اُس نے پوچھا تھا کہ آپکی آنکھیں آج سُرخ کیوں ہیں تو میں نے اس سے کہا تھا کہ دھُوں پڑ گئی ہے۔ اسی طرح ایک بار اُس نے دریافت کیا تھا" یہ بُو کیسی ہے تو میں نے یہ کہہ کر ٹال دیا تھا" آج سیگار پیا تھا۔ بہت بو آتی ہے کم بخت میں"

ڈاکٹر راتھر اکیلا پینے کا عادی تھا۔ اُس کو ساتھی نہیں چاہئے تھے۔ وہ کنجوس تھا۔ اس کے علاوہ اُس کی جیب بھی اجازت نہیں دیتی تھی کہ دوستوں کو پلائے۔ اُس نے بہت سوچا کہ ایسی ترکیب کیا ہو سکتی ہے کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ یعنی یہ مسئلہ کچھ اس طرح حل ہو کہ وہ گھر میں پیا کرے جہاں اس کے دوستوں کو شرکت کرنے کی جرأت نہیں ہو سکتی تھی۔

ڈاکٹر راتھر پورا ڈاکٹر تو نہیں تھا لیکن اُس کو ڈاکٹری کی چند چیزوں کا علم ضرور تھا۔ وہ اتنا جانتا تھا کہ دوائیں بوتلوں میں ڈال کر دی جاتی ہیں۔ اور اُن پر اکثر یہ لکھا ہوتا ہے "شیک دی بوٹل بی فور یوز"۔ اُس نے اتنے علم پر اپنی ترکیب کی دیواریں استوار کیں۔ آخر میں بہت سوچ بچار کے بعد اُس نے یہ سوچا کہ وہ گھر ہی میں پیا کرے گا۔ سانپ بھی مر جائیگا اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹے گی۔ وہ دوا کی بوتل میں شراب ڈلوا کر گھر رکھ دیگا بیوی سے کہے گا کہ اُس کے سر میں درد ہے اور اس کے اُستاد ڈاکٹر سید رمضان علی شاہ نے اپنے ہاتھ سے یہ نسخہ دیا ہے اور کہا ہے کہ شام کو ہر پندرہ منٹ کے بعد ایک خوراک پانی کے ساتھ پیا کرے۔ انشاء اللہ شفا ہو جائیگی۔

یہ ترکیب تلاش کر لینے پر ڈاکٹر راتھر بے حد خوش ہوا۔ اپنی زندگی میں پہلی بار اس نے یوں محسوس کیا جیسے اُس نے ایک نیا امریکہ دریافت کر لیا ہے، چنانچہ صبح سویرے اُٹھ کر اُس نے اپنی بیوی سے کہا۔

"نسیمہ آج میرے سر میں بڑا درد ہو رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے پھٹ جائے گا"

نسیمہ نے بڑے تردّد سے کہا "کالج نہ جائیے آج"

ڈاکٹر راتھر مسکرایا "پگلی، آج تو مجھے ضرور جانا چاہیئے۔ ڈاکٹر سید رمضان علی شاہ صاحب سے پوچھوں گا۔ ان کے ہاتھ میں بڑی شفا ہے"

وہاں ہاں ضرور جائیے ― میرے متعلق بھی ان سے معلوم کیجئے"
نسیمہ کو سیلان الرحم کی شکایت تھی جس سے ڈاکٹر راتھر کو کوئی دلچسپی نہیں تھی، مگر اُس نے کہا۔

"ہاں ہاں بات کر دوں گا۔ مگر مجھے یقین ہے کہ وہ میرے لئے کوئی نہایت ہی کڑوی اور بدبودار دوا تجویز کر دینگے"

"آپ خود ڈاکٹر ہیں، دوائیں مٹھائیاں تو نہیں ہوتیں"

"ٹھیک ہے، لیکن بدبودار دواؤں سے مجھے نفرت ہے"

"آپ دیکھئے تو سہی کیسی دوا دیتے ہیں۔ ابھی سے کیوں ایسی رائے قائم کر رہے ہیں آپ۔؟"

"اچھا" کہہ کر ڈاکٹر راتھر اپنے سر کو دباتا کالج چلا گیا۔ شام کو وہ دوا کی بوتل میں وسکی ڈلوا کے لے آیا۔ اور اپنی بیوی سے کہا "میں نے تم سے کہا تھا نا کہ ڈاکٹر سید رمضان علی شاہ ضرور کوئی ایسی دوا لکھ کر دیں گے جو بے حد کڑوی اور بدبودار ہوگی۔ لو ذرا اسے سونگھو" بوتل کا کارک اُتار کر اُس نے بوتل کا منہ اپنی بیوی کی ناک کے ساتھ لگا دیا۔ اُس نے سونگھا اور ایک دم ناک ہٹا کر کہا۔

"بہت واہیات سی بُو ہے"

"اب ایسی دوا کون پئے۔؟"

"نہیں نہیں۔ آپ ضرور پئیں گے۔ سر کا درد کیسے دُور ہوگا"

"ہو جائے گا اپنے آپ"

"اپنے آپ کیسے دور ہوگا ـ یہی تو آپ کی بُری عادت ہے ـ دوا لاتے ہیں مگر استعمال نہیں کرتے ـ"

"یہ بھی کوئی دوا ہے ـ ایسا لگتا ہے جیسے شراب ہے ـ"

"آپ تو جانتے ہی ہیں کہ انگریزی دواؤں میں شراب ہوا کرتی ہے ـ"

"لعنت ہے ایسی دواؤں پر!"

ڈاکٹر راتھر کی بیوی نے خوراک کے نشان دیکھے اور حیرت سے کہا "اتنی بڑی خوراک!"

ڈاکٹر راتھر نے بُرا سا منہ بنایا "یہی تو مصیبت ہے ـ"

"آپ مصیبت مصیبت نہ کہیں، اللہ کا نام لیکر پہلی خوراک پئیں ـ پانی کتنا ڈالنا ہے ـ"

ڈاکٹر راتھر نے بوتل اپنی بیوی کے ہاتھ سے لی ـ اور مصنوعی طور پر بادلِ ناخواستہ کہا "سوڈا منگوانا پڑے گا ـ عجیب و غریب دوا ہے ـ پانی نہیں سوڈا"

یہ سُن کر نسیم نے کہا "سوڈا اس لئے کہا ہوگا کہ آپ کا معدہ خراب ہے ـ"

"خدا معلوم کیا خراب ہے ـ" یہ کہکر ڈاکٹر راتھر نے ایک خوراک گلاس میں ڈالی "بھئی خدا کی قسم میں نہیں پیوں گا"

بیوی نے بڑے پیار سے اُس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا "نہیں نہیں ـ پی جائیے ـ ناک بند کر لیجئے ـ میں اسی طرح فیور مکسچر پیا کرتی ہوں ـ"

ڈاکٹر راتھر نے بڑے نخروں کے ساتھ شام کا پہلا پیگ پیا ـ بیوی نے اسکو

شاباش دی اور کہا "پندرہ منٹ کے بعد دوسری خوراک ـ خدا کے فضل و کرم سے دردیوں چٹکیوں میں دور ہو جائے گا ـ"

ڈاکٹر راتھر نے سارا ڈھونگ کچھ ایسے خلوص سے رچایا تھا کہ اس کو محسوس ہی نہ ہوا کہ اُس نے دوا کے بجائے شراب پی ہے، لیکن جب ہلکا سا سرور اُس کے دماغ میں نمودار ہوا تو وہ دل ہی دل میں خوب ہنسا ـ ترکیب خوب تھی ـ

اس کی بیوی نے عین پندرہ منٹ کے بعد دوسری خوراک گلاس میں اُنڈیلی ـ اس میں سوڈا ڈالا اور ڈاکٹر راتھر کے پاس لے آئی "یہ لیجئے دوسری خوراک ـ کوئی ایسی بڑی بُو تو نہیں ہے ـ"

ڈاکٹر راتھر نے بڑی بددلی سے کہا "تمہیں پینا پڑے تو معلوم ہو ـ خدا کی قسم شراب کی سی بُو ہے ـ ذرا سونگھ کر تو دیکھو!"

"آپ تو بالکل میری طرح ضد کرتے ہیں ـ"

"نسیم، خدا کی قسم ضد نہیں کرتا ـ ضد کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے ـ لیکن ـ خیر ٹھیک ہے ـ" یہ کہہ کر ڈاکٹر راتھر نے گلاس منہ سے لگایا اور شام کا دوسرا پیگ غٹاغٹ چڑھا گیا ـ

تین خوراکیں ختم ہوگئیں ـ ڈاکٹر راتھر نے کسی قدر افاقہ محسوس ہو گیا ـ لیکن دوسرے روز پھر سر میں درد عود کر آیا ـ ڈاکٹر راتھر نے اپنی بیوی سے کہا "ڈاکٹر سید رمضان علی شاہ نے کہا ہے کہ یہ مرض آہستہ آہستہ دور ہوگا، لیکن دوا کا استعمال برابر جاری رہنا چاہئے ـ خدا معلوم کیا نام

لیا تھا انھوں نے بیماری کا۔ کہا تھا معمولی سر کا درد ہوتا تو دو خوراکوں ہی سے دُور ہو جاتا۔ مگر تمہارا کیس ذرا سیریس ہے۔"

یہ سُن کر نسیمہ نے تردد سے کہا۔ "تو آپ کو دوا اب باقاعدہ پینی پڑے گی۔"

"میں نہیں جانتا۔ تم وقت پر دے دیا کرو گی تو پھر درویش بن جاؤں درویش پی لیا کروں گا۔"

نسیمہ نے ایک خوراک سوڈے میں حل کر کے اُس کو دی۔ اُس کی بُو ناک میں گھسی تو متلی آنے لگی مگر اُس نے اپنے خاوند پر کچھ ظاہر نہ ہونے دیا کیونکہ اُس کو ڈر تھا کہ وہ پینے سے انکار کر دے گا۔

ڈاکٹر راتھر نے تین خوراکیں اپنی بیوی کے بڑے اصرار پر پیں۔ وہ بہت خوش تھی کہ اس کا خاوند اُس کا کہا مان رہا ہے۔ کیونکہ بیوی کی بات ماننے کے معاملے میں ڈاکٹر بہت بدنام تھا۔

کئی دن گذر گئے۔ خوراکیں پینے اور پلانے کا سلسلہ چلتا رہا۔ ڈاکٹر راتھر بڑا مسرور تھا کہ اُس کی ترکیب سودمند ثابت ہوئی۔ اب اُسے دوستوں کا کوئی خدشہ نہیں تھا۔ ہر شام گھر میں بسر ہوتی۔ ایک خوراک پیتا اور لیٹ کر کوئی افسانہ پڑھنا شروع کر دیتا۔ دوسری خوراک عین پندرہ منٹ کے بعد اُس کی بیوی تیار کر کے لے آتی۔ اسی طرح تیسری خوراک اُسے بن مانگے مل جاتی ـــ ڈاکٹر راتھر بے حد مطمئن تھا۔ اتنے دن گذر جانے پر اس کے اور اس کی بیوی کے لئے یہ دوا کا سلسلہ ایک معمول ہو گیا تھا۔

ڈاکٹر راتھر اب ایک پوری بوتل لے آیا تھا۔ اس کا لیبل وغیرہ اُتار کر اِس نے اپنی بیوی سے کہا تھا۔

"کیمسٹ میرا دوست ہے۔ اُس نے مجھ سے کہا۔ آپ ہر روز تین خوراکیں لیتے ہیں، دوا آپ کو یوں مہنگی پڑتی ہے۔ پوری بوتل لے جایئے اس میں سے چھوٹی نشانوں والی بوتل میں ہر روز تین خوراکیں ڈال لیا کیجئے۔ بہت سستی پڑے گی اس طرح آپ کو یہ دوا۔"

یہ سُن کر نسیمہ کو خوشی ہوئی کہ چلو بچت ہو گئی۔ ڈاکٹر راتھر بھی خوش تھا کہ اس کے کچھ پیسے بچ گئے۔ کیونکہ روزانہ تین پیگ لینے میں اُسے زیادہ دام دینے پڑتے تھے۔ اور بوتل آٹھ روپوں میں مل جاتی تھی۔

کالج سے فارغ ہو کر ڈاکٹر راتھر ایک دن گھر آیا تو اس کی بیوی لیٹی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر راتھر نے اس سے کہا۔

"نسیمہ، کھانا نکالو، بہت بھوک لگی ہے۔"

نسیمہ نے کچھ عجیب سے لہجے میں کہا۔ "کھانا۔ کیا آپ کھانا کھا نہیں چکے۔"

"نہیں تو۔"

نسیمہ نے ایک لمبی "نہیں" کہی۔ "آپ۔ کھانا کھا چکے ہیں ـــ میں نے آپ کو دیا تھا۔"

ڈاکٹر راتھر نے حیرت سے کہا۔ "کب دیا تھا؟ میں ابھی ابھی کالج سے آ رہا ہوں۔"

نسیمہ نے ایک جمائی لی۔ "جھوٹ ہے۔ آپ کالج تو گئے ہی نہیں۔"

ڈاکٹر راتھر نے سمجھا نسیمہ مذاق کر رہی ہے چنانچہ وہ مسکرایا "چلو اُٹھو، کھانا نکالو سخت بھوک لگی ہے"

نسیمہ نے ایک اور لمبی "نہیں" کہی "آپ جھوٹ بولتے ہیں۔ میں نے آپ کے ساتھ کھانا کھایا تھا"

"کب؟ — حد ہو گئی ہے — چلو اُٹھو، مذاق نہ کرو" یہ کہہ کر ڈاکٹر راتھر نے اپنی بیوی کا بازو پکڑا "خدا کی قسم میرے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں"

نسیمہ کھلکھلا کر ہنسی "چوہے — آپ یہ چوہے کیوں نہیں کھاتے —؟"

ڈاکٹر راتھر نے بڑے تعجب سے پوچھا۔

"کیا ہو گیا ہے تمہیں —؟"

نسیمہ نے سنجیدگی اختیار کر کے اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور اپنے خاوند سے کہا "میں — میں — سر میں درد تھا میرے — آپ کی دوا کی دو خوراکیں پی ہیں — چوہے — چوہے بہت ستاتے ہیں ان کو مارنے والی گولیاں لے آئیے — کھانا؟ — نکالتی ہوں کھانا"

ڈاکٹر راتھر نے اپنی بیوی سے صرف اتنا کہا "تم سو جاؤ، میں کھانا کھا چکا ہوں"

نسیمہ زور سے ہنسی "میں نے جھوٹ تو نہیں کہا تھا"

ڈاکٹر راتھر نے جب دوسرے کمرے میں جا کر مضطرب حالت میں زمیندار کا تازہ پرچہ کھولا تو اس کو ایک خبر کی سرخی نظر آئی۔ "ڈاکٹر راتھر پر

رحمتِ خداوندی کے پھول" اس کے نیچے یہ درج تھا کہ پولیس نے اس کو دھوکا دہی کے سلسلے میں گرفتار کر لیا ہے۔

غلام رسول عرف ڈاکٹر راتھر نے یہ خبر پڑھ کر یوں محسوس کیا کہ اس پر رحمتِ خداوندی کے پھول برس رہے ہیں۔

عورت ذات

مہاراجہ گ سے ریس کورس پر اشوک کی ملاقات ہوئی۔ اس کے بعد دونوں بے تکلف دوست بن گئے۔

مہاراجہ گ کو ریس کے گھوڑے پالنے کا شوق ہی نہیں خبط تھا۔ اس کے اصطبل میں اچھی سے اچھی نسل کا گھوڑا موجود تھا۔ اور محل میں جس کے گنبد ریس کورس سے صاف دکھائی دیتے تھے طرح طرح کے عجائب موجود تھے۔

اشوک جب پہلی بار محل میں گیا تو مہاراجہ گ نے کئی گھنٹے صرف کر کے اس کو اپنے تمام نوادر دکھائے۔ یہ چیزیں جمع کرنے میں مہاراجہ کو ساری دنیا کا دورہ کرنا پڑا تھا۔ ہر ملک کا کونہ کونہ چھاننا پڑا تھا۔ اشوک بہت متاثر ہوا۔ چنانچہ اس نے نوجوان مہاراجہ گ کے ذوقِ انتخاب کی خوب داد دی۔

ایک دن اشوک گھوڑوں کے ٹپ لینے کے لئے مہاراجہ کے پاس گیا

تو وہ ڈارک روم میں فلم دیکھ رہا تھا۔ اس نے اشوک کو وہیں بلوا لیا سکسٹین ملی میٹر فلم تھے۔ جو مہاراجہ نے خود اپنے کیمرے سے لئے تھے۔ جب پروجیکٹر چلا تو پچھلی ریس پوری کی پوری پردے پر دوڑ گئی۔ مہاراجہ کا گھوڑا اس ریس میں ون آیا تھا۔

اس فلم کے بعد مہاراجہ نے اشوک کی فرمائش پر اور کئی فلم دکھائے سوئیزر لینڈ' پیرس' نیویارک' ہونولولو' ہوائی' وادیٔ کشمیر — اشوک بہت محظوظ ہوا یہ فلم قدرتی رنگوں میں تھے۔

اشوک کے پاس بھی سکسٹین ملی میٹر کیمرہ اور پروجیکٹر تھا۔ مگر اس کے پاس فلموں کا اتنا ذخیرہ نہیں تھا۔ دراصل اس کو اتنی فرصت ہی نہیں ملتی تھی کہ اپنا یہ شوق جی بھر کے پورا کر سکے۔

مہاراجہ جب کچھ فلم دکھا چکا تو اس نے کمرے میں روشنی کی اور بڑی بے تکلفی سے اشوک کی ران پر دھپا مار کر کہا۔

"اور سناؤ دوست"

اشوک نے سگریٹ سلگایا: "مزا آ گیا فلم دیکھ کر"

"اور دکھاؤں۔؟"

"نہیں نہیں"

"نہیں بھئی ایک ضرور دیکھو۔ مزا آ جائے گا تمہیں" یہ کہہ کر مہاراجہ گ نے ایک صندوقچہ کھول کر ایک ریل نکالی اور پروجیکٹر پر چڑھا دی "ذرا اطمینان سے دیکھنا۔

اشوک نے پوچھا "کیا مطلب۔؟"

مہاراجہ نے کمرے کی لائٹ اوف کر دی "مطلب یہ کہ ہر چیز غور سے دیکھنا" کہہ کر اس نے پروجیکٹر کا سوئچ دبا دیا۔

پردے پر چند لمحات صرف سفید روشنی تھرتھراتی رہی، پھر ایک دم تصویریں شروع ہو گئیں۔ اور اب برہنگی ناچ رہی تھی۔

اشوک کچھ دیر خاموش بیٹھا دیکھتا رہا۔ اس کے بعد ایک دم اس کے حلق سے عجیب و غریب آواز نکلی۔ مہاراجہ نے ہنس کر اس سے پوچھا۔

"کیا ہوا۔؟"

اشوک کے حلق سے آواز پھنس پھنس کر باہر نکلی "بند کرو یار بند کرو"

"کیا بند کرو۔؟"

اشوک اُٹھنے لگا، مگر مہاراجہ گ نے اسے پکڑ کر بٹھا دیا "یہ فلم تمہیں پورے کا پورا دیکھنا پڑے گا"

فلم چلتا رہا، پردے پر برہنگی منہ کھولے ناچتی رہی، مادر زاد عُریانی کے ساتھ تھرکتی رہی۔ اشوک نے سارا وقت پسینے میں کاٹا، جب فلم بند ہوا اور پردے پر صرف سفید روشنی تھی تو اشوک کو ایسا محسوس ہوا کہ جو کچھ اس نے دیکھا تھا پروجیکٹر کی بجائے اس کی آنکھیں پھینک رہی ہیں۔

مہاراجہ گ نے کمرے کی لائٹ اون کی اور اشوک کی طرف دیکھا اور ایک زور کا قہقہہ لگایا۔

"کیا ہو گیا ہے تمہیں۔؟"

اشوک کچھ سکڑ سا گیا تھا۔ ایک دم روشنی ہونے کے باعث اس کی آنکھیں بھنچی ہوئی تھیں ماتھے پر پسینے کے موٹے موٹے قطرے تھے۔ مہاراجہ گ نے زور سے اس کی ران پر دھپا مارا اور اس قدر بے تحاشا ہنسا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اشوک صوفے پر سے اُٹھا رومال نکال کر اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھا۔

"کچھ نہیں یار"

"کچھ نہیں کیا۔ مزا نہیں آیا۔؟"

اشوک کا حلق سوکھا ہوا تھا۔ تھوک نگل کر اس نے کہا "کہاں سے لائے یہ فلم۔؟"

مہاراجہ نے صوفے پر لیٹتے ہوئے جواب دیا "پیرس سے۔ پے رس۔ پے رس!"

اشوک نے سر کو جھٹکا سا دیا "کچھ سمجھ میں نہیں آتا"

"کیا۔؟"

"یہ لوگ۔ میرا مطلب ہے کیمرے کے سامنے یہ لوگ کیسے۔"

"یہی تو کمال ہے۔ ہے کہ نہیں۔؟"

"یہ ہے تو سہی" یہ کہہ کر اشوک نے رومال سے اپنی آنکھیں صاف کیں "ساری تصویریں جیسے میری آنکھوں میں پھنس سی گئی ہیں"

مہاراجہ گ اُٹھا۔

"میں نے ایک دفعہ چند لیڈیز کو یہ فلم دکھایا"

اشوک چلّایا "لیڈیز کو — ؟"

"ہاں ہاں — بڑے مزے لے لے کر دیکھا اُنھوں نے"

"غلط"

مہاراجہ نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہا "سچ کہتا ہوں۔ ایک دفعہ دیکھ کر دوسری دفعہ پھر دیکھا۔ چیختی چلّاتی اور ہنستی رہیں"

اشوک نے اپنے سر کو جھٹکا سا دیا "حد ہوگئی ہے۔ میں تو سمجھتا تھا وہ بے ہوش ہوگئی ہوں گی"

"میرا بھی یہی خیال تھا۔ لیکن اُنھوں نے خوب لطف اُٹھایا"

اشوک نے کہا۔

"کیا یورپین تھیں — ؟"

مہاراجہ گٹ نے کہا۔

"نہیں بھائی — اپنے دیس کی تھیں — مجھ سے کئی بار یہ فلم اور پروجیکٹر مانگ کرلے گئیں۔ معلوم نہیں کتنی سہیلیوں کو دکھا چکی ہیں"

"میں نے کہا ……"

اشوک کچھ کہتے کہتے رُک گیا۔

"کیا — ؟"

"ایک دو روز کے لئے یہ فلم دے سکتے ہو مجھے — ؟"

"ہاں ہاں لے جاؤ" یہ کہہ کر مہاراجہ نے اشوک کی پسلیوں میں ٹھوکا دیا۔ "سالے کس کو دکھائے گا — ؟"

"دوستوں کو"

"دکھا جس کو بھی تیری مرضی !"

یہ کہہ کر مہاراجہ گٹ نے پروجیکٹر میں سے فلم کا اسپول نکالا اس کو دوسرے اسپول پر چڑھا دیا۔ اور ڈبہ اشوک کے حوالہ کردیا۔

"لے پکڑ — عیش کر"

اشوک نے ڈبہ ہاتھ میں لے لیا۔ تو اس کے بدن میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔ گھوڑوں کے ٹپ لینا بھول گیا اور چند منٹ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد چلا گیا۔

گھر سے پروجیکٹر لے جاکر اس نے کئی دوستوں کو یہ فلم دکھایا تقریباً سب کے لئے انسانیت کی یہ عریانی بالکل نئی چیز تھی۔ اشوک نے ہر ایک کا ردِعمل نوٹ کیا۔ بعض نے خفیف سی گھبراہٹ اور فلم کا ایک ایک انچ غور سے دیکھا۔ بعض نے تھوڑا سا دیکھ کر آنکھیں بند کرلیں۔ بعض آنکھیں کھلی رکھنے کے باوجود فلم کو تمام وکمال طور پر نہ دیکھ سکے۔ ایک برداشت نہ کرسکا۔ اور اُٹھ کر چلا گیا۔

تین چار روز کے بعد اشوک کو فلم لوٹانے کا خیال آیا تو اس نے سوچا کیوں نہ اپنی بیوی کو دکھاؤں چنانچہ وہ پروجیکٹر اپنے گھر لے گیا۔ رات ہوئی تو اس نے اپنی بیوی کو بُلایا۔ دروازے بند کئے۔ پروجیکٹر کا کنکشن وغیرہ ٹھیک کیا۔ فلم نکالا اس کو فٹ کیا۔ کمرے کی بتی بجھائی اور فلم چلا دیا۔

پردے پر چند لمحات روشنی تھرتھرائی۔ پھر تصویریں شروع ہوئیں۔ اشوک

کی بیوی زور سے چیخی، تڑپی، اُچھلی، اس کے منہ سے عجیب وغریب آوازیں نکلیں۔ اشوک نے اسے پکڑ کر بٹھانا چاہا تو اس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے اور چیخنا شروع کر دیا۔

"بند کرو۔ بند کرو"

اشوک نے ہنس کر کہا۔

"ارے بھئی دیکھ لو۔ شرماتی کیوں ہو"

"نہیں نہیں"

یہ کہہ کر اس نے ہاتھ چھڑا کر بھاگنا چاہا۔

اشوک نے اس کو زور سے پکڑ لیا۔ وہ ہاتھ جو اس کی آنکھوں پر تھا ایک طرف کھینچا، اس کھینچا تانی میں دفعتاً اشوک کی بیوی نے رونا شروع کر دیا۔ اشوک کے بریک سی لگ گئی۔ اس نے تو محض تفریح کی خاطر اپنی بیوی کو فلم دکھایا تھا۔

روتی اور بڑبڑاتی اُس کی بیوی دروازہ کھول کر باہر نکل گئی، اشوک چند لمحات بالکل خالی الذہن بیٹھا ننگی تصویریں دیکھتا رہا جو بیوانی حرکات میں مشغول تھیں۔ پھر ایک دم اس نے معاملے کی نزاکت کو محسوس کیا۔ اس احساس نے اسے خیالات کے سمندر میں غرق کر دیا۔ اس نے سوچا مجھ سے بہت ہی نازیبا حرکت سرزد ہوئی۔ لیکن حیرت ہے کہ مجھے اس کا خیال تک نہ آیا ـــــ دوستوں کو دکھایا تھا، ٹھیک تھا، گھر میں اور کسی کو نہیں اپنی بیوی کو، ...... اس کے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔

فلم چل رہا تھا، مادرزاد برہنگی مختلف آسن اختیار کرتی دوڑ رہی تھی۔ اشوک نے اُٹھ کر سوئچ اوف کر دیا ـــ پردے پر سب کچھ بجھ گیا، مگر اُس نے اپنی نگاہیں دوسری طرف پھیر لیں، اس کا دل، دماغ شرمساری میں ڈوبا ہوا تھا۔ یہ احساس اس کو چبھ رہا تھا کہ اس سے ایک نہایت ہی نازیبا۔ نہایت ہی واہیات حرکت سرزد ہوئی ہے۔ اس نے یہاں تک سوچا کہ وہ کیسے اپنی بیوی سے آنکھ ملا سکے گا،

کمرے میں گھُپ اندھیرا تھا۔ ایک سگریٹ سُلگا کر اس نے احساسِ ندامت کو مختلف خیالوں کے ذریعے سے دُور کرنے کی کوشش کی، مگر کامیاب نہ ہوا۔ تھوڑی دیر دماغ میں اِدھر اُدھر ہاتھ مارتا رہا۔ جب چاروں طرف سے سرزنش ہی سرزنش ہوئی تو زچ بچ ہو گیا۔ اور ایک عجیب سی خواہش اس کے دل میں پیدا ہوئی کہ جس طرح کمرے میں اندھیرا ہے اسی طرح اس کے دماغ پر بھی اندھیرا چھا جائے،

بار بار اسے یہ چیز ستا رہی تھی "ایسی واہیات حرکت اور مجھے خیال تک نہ آیا"

پھر وہ سوچتا "بات اگر ساس تک پہنچ گئی ـــ سالیوں کو پتہ چل گیا میرے متعلق کیا رائے قائم کریں گے۔ یہ لوگ کہ کیسے گرے ہوئے اخلاق کا آدمی نکلا ـــ ایسی گندی ذہنیت کہ اپنی بیوی کو ......

تنگ آکر اشوک نے سگریٹ سلگایا، وہ ننگی تصویریں جو وہ کئی بار دیکھ چکا تھا اِس کی آنکھوں کے سامنے ناچنے لگیں۔ ان کے عقب میں اسے اپنی بیوی کا چہرہ نظر آتا۔ حیران و پریشان جس نے زندگی میں

پہلی بار عفونت کا اتنا بڑا ڈھیر دیکھا ہو، سر جھٹک کر اشوک اُٹھا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ مگر اس سے بھی اس کا اضطراب دور نہ ہوا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ دبے پاؤں کمرے سے باہر نکلا، ساتھ والے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ اس کی بیوی منہ سر لپیٹ کر لیٹی ہوئی تھی، کافی دیر کھڑا سوچتا رہا کہ اندر جاکر مناسب و موزوں الفاظ میں اس سے معافی مانگے، مگر خود میں اتنی جرأت پیدا نہ کر سکا۔ دبے پاؤں لوٹا اور اندھیرے کمرے میں صوفے پر لیٹ گیا، دیر تک جاگتا رہا، آخر سو گیا،

صبح سویرے اُٹھا، رات کا واقعہ اس کے ذہن میں تازہ ہو گیا، اشوک نے بیوی سے ملنا مناسب نہ سمجھا اور ناشتہ کئے بغیر نکل گیا۔

آفس میں اس نے دل لگا کر کوئی کام نہ کیا، یہ احساس اس کے دل و دماغ کے ساتھ چپک کر رہ گیا تھا "ایسی واہیات حرکت اور مجھے خیال تک نہ آیا"

کئی بار اس نے گھر بیوی کو ٹیلیفون کرنے کا ارادہ کیا مگر ہر بار نمبر کے آدھے ہندسے گھما کر ریسیور رکھ دیا، دوپہر کو گھر سے جب اس کا کھانا آیا، تو اس نے نوکر سے پوچھا۔

"میم صاحب نے کھانا کھا لیا۔؟"

نوکر نے جواب دیا "جی نہیں — وہ کہیں باہر گئی ہیں"

"کہاں۔؟"

"معلوم نہیں صاحب!"

"کب گئی تھیں۔؟"

"گیارہ بجے"

اشوک کا دل دھڑکنے لگا۔ بھوک غائب ہو گئی۔ دو چار نوالے کھائے اور ہاتھ اُٹھا لیا۔ اس کے دماغ میں ہلچل مچ گئی تھی۔ طرح طرح کے خیالات پیدا ہو رہے تھے۔ "گیارہ بجے — ابھی تک لوٹی نہیں۔ گئی کہاں ہے — ماں کے پاس؟ — کیا وہ اسے سب کچھ بتا دیگی؟ — ضرور بتائے گی۔ ماں سے بیٹی سب کچھ کہہ سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بہنوں کے پاس گئی ہو — سنیں گی تو کیا کہیں گی۔؟ — دونوں میری کتنی عزت کرتی تھیں، جانے بات کہاں سے کہاں پہنچے گی۔ ایسی واہیات حرکت اور مجھے خیال تک نہ آیا"

اشوک آفس سے باہر نکل گیا، موٹر لی اور ادھر اُدھر آوارہ چکر لگاتا رہا۔ جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو اس نے موٹر کا رُخ گھر کی طرف پھیر دیا۔ "دیکھا جائے گا جو کچھ ہو گا"

گھر کے پاس پہنچا تو اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ جب لفٹ ایک دھچکے کے ساتھ اوپر اُٹھی تو اس کا دل اُچھل کر اس کے منہ میں آگیا۔

لفٹ تیسری منزل پر رُکی، کچھ دیر سوچ کر اس نے دروازہ کھولا، اپنے فلیٹ کے پاس پہنچا تو اس کے قدم رُک گئے۔ اس نے سوچا کہ لوٹ

جائے۔ مگر فلیٹ کا دروازہ کھلا اور اس کا نوکر بیڑی پینے کے لئے باہر نکلا' اشوک کو دیکھ کر اس نے بیڑی ہاتھ میں چھپالی اور سلام کیا' اشوک کو اندر داخل ہونا پڑا'

نوکر پیچھے پیچھے آرہا تھا' اشوک نے پلٹ کر اس سے پوچھا "میم صاحب کہاں ہیں۔؟"

نوکر نے جواب دیا۔

"اندر کمرے میں ہیں!"

"اور کون ہے۔؟"

"اُن کی بہنیں صاحب ——— کو لابے والے صاحب کی میم صاحب اور دو پارسی بائیاں۔؟"

یہ سُن کر اشوک بڑے کمرے کی طرف بڑھا' دروازہ بند تھا اُس نے دھکا دیا' اندر سے اشوک کی بیوی کی پتلی مگر تیز آواز آئی۔

"کون ہے۔؟"

نوکر بولا۔

"صاحب"

اندر کمرے میں ایک دم گڑبڑ شروع ہوگئی۔ چیخیں بُلند ہوئیں۔ دروازوں کی چٹخنیاں کُھلنے کی آوازیں آئیں' کھٹ کھٹ' پھٹ پھٹ ہوئی' اشوک کوری ڈور سے ہوتا پچھلے دروازے سے کمرے میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ پروجیکٹر چل رہا ہے اور پردے پر دن کی

روشنی میں دھندلی دھندلی انسانی شکلیں ایک نفرت انگیز مکان کی یک آہنگی کے ساتھ حیوانی حرکات میں مشغول ہیں۔

اشوک بے تحاشہ ہنسنے لگا۔

ساڑھے تین آنے!

"میں نے قتل کیوں کیا۔ ایک انسان کے خون میں اپنے ہاتھ کیوں رنگے، یہ ایک لمبی داستان ہے۔ جب تک میں اس کے تمام عواقب دعواطف سے آپ کو آگاہ نہیں کروں گا۔ آپ کو کچھ پتہ نہیں چلے گا۔ مگر اس وقت آپ لوگوں کی گفتگو کا موضوع جرم اور سزا ہے۔ انسان اور جیل ہے — چونکہ میں جیل میں رہ چکا ہوں، اس لئے میری رائے نادرست نہیں ہوسکتی۔ مجھے منٹو صاحب سے پورا اتفاق ہے کہ جیل، مجرم کی اصلاح نہیں کرسکتی۔ مگر یہ حقیقت اتنی بار دُہرائی جا چکی ہے کہ اس پر زور دینے سے آدمی کو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ کسی محفل میں ہزار بار سُنایا ہوا لطیفہ بیان کر رہا ہے — اور یہ لطیفہ نہیں کہ اس حقیقت کو جانتے پہچانتے ہوئے بھی ہزارہا جیل خانے موجود ہیں۔ ہتھکڑیاں ہیں اور وہ ننگِ انسانیت بیڑیاں — میں قانون کا یہ زیور پہن چکا ہوں۔"

یہ کہکر رضوی نے میری طرف دیکھا اور مُسکرایا۔ اُس کے موٹے موٹے حبشیوں کے سے ہونٹ عجیب انداز میں پھڑکے۔ اُس کی چھوٹی چھوٹی مخمور آنکھیں، جو قاتل کی آنکھیں لگتی تھیں چمکیں۔ ہم سب چونک پڑے تھے۔ جب اس نے یکایک ہماری گفتگو میں حصّہ لینا شروع کر دیا تھا۔ وہ ہمارے قریب کُرسی پر بیٹھا کریم ملی ہوئی کوفی پی رہا تھا۔ جب اُس نے خود کو متعارف کرایا تو ہمیں وہ تمام واقعات یاد آگئے، جو اس کی قتل کی واردات سے وابستہ تھے۔ وعدہ معاف گواہ بن کر اُس نے بڑی صفائی سے اپنی اور اپنے دوستوں کی گردن پھانسی کے پھندے سے بچائی تھی۔

وہ اسی دن رہا ہو کر آیا تھا۔ بڑے شائستہ انداز میں وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "معاف کیجئے گا منٹو صاحب — آپ لوگوں کی گفتگو سے مجھے دلچسپی ہے — میں ادیب تو نہیں، لیکن آپ لوگوں کی گفتگو کا جو موضوع ہے اس پر اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان میں کچھ نہ کچھ ضرور کہہ سکتا ہوں۔" پھر اس نے کہا: "میرا نام صدیق رضوی ہے — لنڈا بازار میں جو قتل ہوا تھا، میں اُس سے متعلق تھا۔"

میں نے اس قتل کے متعلق صرف سرسری طور پر پڑھا تھا۔ لیکن جب رضوی نے اپنا تعارف کرایا تو میرے ذہن میں خبروں کی تمام سُرخیاں اُبھر آئیں۔ ہماری گفتگو کا موضوع یہ تھا کہ آیا جیل مجرم کی اصلاح کرسکتی ہے میں خود محسوس کر رہا تھا۔ ہم ایک باسی روٹی کھا رہے ہیں۔ رضوی نے جب

یہ کہا: "یہ حقیقت اتنی بار دُہرائی جا چکی ہے کہ اس پر زور دینے سے آدمی کو یوں محسوس ہوتا ہے۔ جیسے وہ کسی محفل میں ہزار بار سُنایا ہوا لطیفہ بیان کر رہا ہے" تو مجھے بڑی تسکین ہوئی۔ میں نے یہ سمجھا جیسے رضوی نے میرے خیالات کی ترجمانی کر دی ہو۔

کریم ملی ہوئی کوفی کی پیالی ختم کر کے رضوی نے اپنی چھوٹی چھوٹی مخمور آنکھوں سے مجھے دیکھا اور بڑی سنجیدگی سے کہا۔

"منٹو صاحب آدمی جرم کیوں کرتا ہے — جرم کیا ہے، سزا کیا ہے۔ میں نے اس کے متعلق بہت غور کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہر جرم کے پیچھے ایک ہسٹری ہوتی ہے — زندگی کے واقعات کا ایک بہت بڑا مجموعہ ہوتا ہے، بہت اُلجھا ہوا، ٹیڑھا میڑھا — میں نفسیات کا ماہر نہیں — لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ انسان سے خود جرم سرزد نہیں ہوتا۔ حالات سے ہوتا ہے۔"

نصیر نے کہا: "آپ نے بالکل درست کہا ہے"

رضوی نے ایک اور کافی کا آرڈر دیا اور نصیر سے کہا: "مجھے معلوم نہیں جناب، لیکن میں نے جو کچھ عرض کیا ہے اپنے مشاہدات کی بنا پر عرض کیا ہے۔ ورنہ یہ موضوع بہت پُرانا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وکٹر ہیوگو — فرانس کا ایک مشہور ناولسٹ تھا— شاید کسی اور ملک کا ہو — آپ تو خیر جانتے ہی ہوں گے، 'جرم اور سزا' پر اُس نے کافی لکھا ہے — مجھے اُس کی ایک تصنیف کے چند فقرے یاد ہیں" یہ کہہ کر وہ مجھ سے مخاطب ہوا: "منٹو صاحب

غالباً آپ ہی کا ترجمہ تھا — کیا تھا؟ — وہ سیڑھی اُتار دو جو انسان کو جرائم اور مصائب کی طرف لے جاتی ہے — لیکن میں سوچتا ہوں کہ وہ سیڑھی کون سی ہے — اس کے کتنے زینے ہیں۔

کچھ بھی ہو، یہ سیڑھی ضرور ہے، اس کے زینے بھی ہیں، لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں، بے شمار ہیں، ان کو گننا، ان کا شمار کرنا ہی سب سے بڑی بات ہے — منٹو صاحب، حکومتیں۔ ان کے شماری کرتی ہیں، حکومتیں اعداد و شمار کرتی ہیں، حکومتیں ہر قسم کی شماری کرتی ہیں۔ اس سیڑھی کے زینوں کی شماری کیوں نہیں کرتیں — کیا یہ اُن کا فرض نہیں — میں نے قتل کیا — لیکن اس سیڑھی کے کتنے زینے طے کر کے کیا۔ حکومت نے مجھے وعدہ معاف گواہ بنا لیا، اس لئے کہ قتل کا ثبوت اس کے پاس نہیں تھا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ میں اپنے گناہ کی معافی کس سے مانگوں — وہ حالات جنہوں نے مجھے قتل کرنے پر مجبور کیا تھا۔ اب میرے نزدیک نہیں ہیں۔ ان میں اور مجھ میں ایک برس کا فاصلہ ہے — میں اس فاصلے سے معافی مانگوں یا ان حالات سے جو بہت دور کھڑے میرا منہ چڑا رہے ہیں"

ہم سب رضوی کی باتیں بڑے غور سے سُن رہے تھے۔ وہ بظاہر تعلیمیافتہ معلوم نہیں ہوتا تھا۔ لیکن اُس کی گفتگو سے ثابت ہوا کہ وہ پڑھا لکھا ہے اور بات کرنے کا سلیقہ جانتا ہے۔ میں نے اُس سے کچھ کہا ہوتا، لیکن میں چاہتا تھا کہ وہ باتیں کرتا جائے اور میں سنتا جاؤں۔ اسی لئے میں اس کی گفتگو میں حائل نہ ہوا۔

اُس کے لئے نئی کوئی آگئی تھی۔ اسے بنا کر اُس نے چند گھونٹ پئے اور کہنا شروع کیا۔

"خدا معلوم میں کیا بکواس کرتا رہا ہوں، لیکن میرے ذہن میں ہر وقت ایک آدمی کا خیال رہا ہے ــــ اُس آدمی کا، اُس بھنگی کا جو ہمارے ساتھ جیل میں تھا۔ اس کو ساڑھے تین آنے چوری کرنے پر ایک برس کی سزا ہوئی تھی۔"

نصیر نے حیرت سے پوچھا: "صرف ساڑھے تین آنے چوری کرنے پر ــ ؟"

رضوی نے تلخ آلود جواب دیا: "جی ہاں ــــ صرف ساڑھے تین آنے کی چوری پر ــــ اور جو اُس کو نصیب نہ ہوئے، کیونکہ وہ پکڑا گیا ــــ یہ رقم خزانے میں محفوظ ہے اور بھگو بھنگی غیر محفوظ ہے۔ کیونکہ ہو سکتا ہے وہ پھر پکڑا جائے، کیونکہ ہو سکتا ہے اُس کا پیٹ پھر اسے مجبور کرے۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ اُس سے گو موت صاف کرانے والے اُس کی تنخواہ نہ دے سکیں، کیونکہ ہو سکتا ہے اس کو تنخواہ دینے والوں کو اپنی تنخواہ نہ ملے ــــ یہ ہو سکتا ہے کا سلسلہ منٹو صاحب عجیب و غریب ہے۔ سچ پوچھئے تو دنیا میں سب کچھ ہو سکتا ہے۔ ــ رضوی سے قتل بھی ہو سکتا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ تھوڑے عرصے کے لئے خاموش ہو گیا۔ نصیر نے اُس سے کہا۔

"آپ بھگو بھنگی کی بات کر رہے تھے۔ ؟"

رضوی نے اپنی چھدری مونچھوں پر سے کوئی رومال کے ساتھ پونچھی: "جی ہاں ــ بھگو بھنگی چور ہونے کے باوجود، یعنی وہ قانون کی نظروں میں چور تھا ــ لیکن ہماری نظروں میں پورا ایماندار ــ خدا کی قسم میں نے آج تک اس جیسا ایماندار آدمی نہیں دیکھا۔ ساڑھے تین آنے اُس نے ضرور چرائے تھے۔ اس نے صاف صاف عدالت میں کہہ دیا تھا کہ یہ چوری میں نے ضرور کی ہے، میں اپنے حق میں کوئی گواہی پیش کرنا نہیں چاہتا ــ میں دو دن کا بھوکا تھا۔ مجبوراً مجھے کریم درزی کی جیب میں ہاتھ ڈالنا پڑا۔ اُس سے مجھے پانچ روپے لینے تھے ــــ دو مہینوں کی تنخواہ ــــ حضور اُس کا بھی کچھ قصور نہیں تھا۔ اس لئے کہ اس کے کئی گاہکوں نے اس کی سلائی کے پیسے مارے ہوئے تھے ــــ حضور، میں پہلے بھی چوریاں کر چکا ہوں۔ ایک دفعہ میں نے دس روپے ایک میم صاحب کے بٹوے سے نکال لئے تھے۔ مجھے ایک مہینے کی سزا ہوئی تھی۔ پھر میں نے ڈپٹی صاحب کے گھر سے چاندی کا ایک کھلونا چرایا تھا۔ اس لئے کہ میرے بچے کو نمونیا تھا۔ اور ڈاکٹر بہت فیس مانگتا تھا۔ حضور میں آپ سے جھوٹ نہیں کہتا۔ میں چور نہیں ہوں ــــ کچھ حالات ہی ایسے تھے ــــ کہ مجھے چوریاں کرنی پڑیں ــــ اور حالات ہی ایسے تھے کہ میں پکڑا گیا۔ مجھ سے بڑے بڑے چور موجود ہیں۔ لیکن وہ ابھی تک پکڑے نہیں گئے ــ حضور، اب میرا بچہ بھی نہیں ہے، بیوی بھی نہیں ہے۔ لیکن حضور افسوس ہے کہ میرا پیٹ ہے، یہ مر جائے تو سارا جھنجھٹ ہی ختم ہو جائے، حضور مجھے معاف کر دو۔ لیکن حضور نے اس کو معاف نہ کیا اور

عادی چور سمجھ کر اس کو ایک برس قید با مشقت کی سزا دے دی۔"

رضوی بڑے بے تکلف انداز میں بول رہا تھا۔ اس میں کوئی تصنع، کوئی بناوٹ نہیں تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ الفاظ خود بخود اس کی زبان پر آتے اور بہتے چلے جا رہے ہیں۔ میں بالکل خاموش تھا۔ سگریٹ پہ سگریٹ پی رہا تھا۔ اور اس کی باتیں سُن رہا تھا۔ نصیر پھر اس سے مخاطب ہوا۔

"آپ بھگو کی ایمانداری کی بات کر رہے تھے۔۔؟"

"جی ہاں" رضوی نے جیب سے بیڑی نکال کر سلگائی "میں نہیں جانتا قانون کی نگاہوں میں ایمانداری کیا چیز ہے، لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ میں نے بڑی ایمانداری سے قتل کیا تھا۔ اور میرا خیال ہے کہ بھگو بھنگی نے بھی بڑی ایمانداری سے ساڑھے تین آنے چرائے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ ایمانداری کو صرف اچھی باتوں سے کیوں منسوب کرتے ہیں، اور سچ پوچھئے تو اب میں یہ سوچنے لگا ہوں کہ اچھائی اور برائی ہے کیا چیز۔ ایک چیز آپ کے لئے اچھی ہو سکتی ہے، میرے لئے بُری۔ ایک سوسائٹی میں ایک چیز اچھی سمجھی جاتی ہے، دوسری میں بُری ۔۔۔ ہمارے مسلمانوں میں بغلوں کے بال بڑھانا گناہ سمجھا جاتا ہے، لیکن سکھ اس سے بے نیاز ہیں۔ اگر یہ بال بڑھانا واقعی گناہ ہے تو خدا اُن کو سزا کیوں نہیں دیتا۔ اگر کوئی خدا ہے تو میری اس سے درخواست ہے کہ خدا کے لئے تم یہ انسانوں کے قوانین توڑ دو، ان کی بنائی ہوئی جیلیں ڈھا دو ۔۔۔ اور آسمانوں پر اپنی جیلیں خود بناؤ۔ خود اپنی عدالت میں ان کو سزا دو، کیونکہ اور کچھ نہیں

تو کم از کم خدا تو ہو۔"

رضوی کی اس تقریر نے مجھے بہت متاثر کیا۔ اس کی خامکاری ہی اصل میں تاثر کا باعث تھی۔ وہ باتیں کرتا تھا تو یوں لگتا تھا جیسے وہ ہم سے نہیں بلکہ اپنے آپ سے دل ہی دل میں گفتگو کر رہا ہے۔

اُس کی بیڑی بجھ گئی تھی، غالباً اس میں تمباکو کی گانٹھ اٹکی ہوئی تھی۔ اس لئے کہ اُس نے پانچ چھ مرتبہ اس کو سلگانے کی کوشش کی۔ جب نہ سلگی تو پھینک دی اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

"منٹو صاحب، بھگو مجھے اپنی تمام زندگی میں یاد رہے گا ۔۔۔ آپ کو بتاؤں گا تو آپ ضرور کہیں گے کہ جذباتیت ہے، لیکن خدا کی قسم جذباتیت کو اس میں کوئی دخل نہیں ۔۔۔ وہ میرا دوست نہیں تھا ۔۔۔ نہیں وہ میرا دوست تھا کیونکہ اُس نے ہر بار خود کو ایسا ہی ثابت کیا۔"

رضوی نے جیب میں سے دوسری بیڑی نکالی مگر وہ ٹوٹی ہوئی تھی۔ میں نے اُسے سگریٹ پیش کیا تو اُس نے قبول کر لیا۔

"شکریہ ۔۔۔۔ منٹو صاحب، معاف کیجئے گا، میں نے اتنی بکواس کی ہے۔ حالانکہ مجھے نہیں کرنی چاہیئے تھی۔ اس لئے کہ ماشاءاللہ آپ ۔۔۔۔"

میں نے اس کی بات کاٹی "رضوی صاحب، میں اس وقت منٹو نہیں ہوں۔ صرف سعادت حسن ہوں۔ آپ اپنی گفتگو جاری رکھئے میں بڑی دلچسپی سے سُن رہا ہوں۔"

رضوتی مسکرایا۔ اُس کی چھوٹی چھوٹی مخمور آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی "آپ کی بڑی نوازش ہے" پھر وہ نصیر سے مخاطب ہوا "میں کیا کہہ رہا تھا۔؟"

میں نے اُس سے کہا "آپ بھگو کی ایمانداری کے متعلق کچھ کہنا چاہتے تھے"

"جی ہاں" یہ کہکر اُس نے میرا پیش کیا ہوا سگریٹ سلگایا "منٹو صاحب، قانون کی نظروں میں وہ عادی چور تھا۔ بیڑیوں کے لئے ایک دفعہ اُس نے آٹھ آنے چُرائے تھے۔ بڑی مشکلوں سے دیوار پھاند کر جب اُس نے بھاگنے کی کوشش کی تھی تو اس کے ٹخنے کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ تقریب قریب ایک برس تک وہ اس کا علاج کراتا رہا تھا۔ مگر جب میرا ہم النام دوست جرجی بیس بیڑیاں اس کی معرفت بھیجتا تو وہ سب کی سب پولیس کی نظریں بچا کر میرے حوالے کر دیتا۔ وعدہ معاف گواہوں پر بہت کڑی نگرانی ہوتی ہے، لیکن جرجی نے بھگو کو اپنا دوست اور ہمراز بنا لیا تھا۔ وہ بھنگی تھا، لیکن اس کی فطرت بہت خوشبودار تھی۔ شروع شروع میں وہ جرجی کی بیڑیاں لیکر میرے پاس آیا تو میں نے سوچا، اس حرامزادے چور نے ضرور ان میں سے کچھ غائب کر لی ہوں گی، مگر بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ قطعی طور پر ایماندار تھا۔ بیڑی کے لئے اُس نے آٹھ آنے چُراتے ہوئے اپنے ٹخنے کی ہڈی تڑوا لی تھی۔ مگر یہاں جیل میں جہاں اُس کو تمباکو کہیں سے بھی نہیں مل سکتا تھا۔ وہ جرجی کی دی ہوئی بیڑیاں تمام و کمال

میرے حوالے کر دیتا تھا، جیسے وہ امانت ہوں ـــ پھر وہ کچھ دیر ہچکچانے کے بعد مجھ سے کہتا، "بابو جی، ایک بیڑی تو دیجئے" اور میں اس کو صرف ایک بیڑی دیتا ـــ انسان بھی کتنا کمینہ ہے!"

رضوتی نے کچھ اس انداز سے اپنا سر جھٹکا جیسے وہ اپنے آپ سے متنفر ہے "جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں مجھ پر بہت کڑی پابندیاں عائد تھیں وعدہ معاف گواہوں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ جرجی البتہ میرے مقابلے میں بہت آزاد تھا۔ اس کو رشوت دے دلا کر بہت آسانیاں مہیا تھیں۔ کپڑے مل جاتے تھے صابن مل جاتا تھا۔ بیڑیاں مل جاتی تھیں۔ جیل کے اندر رشوت دینے کے لئے روپے بھی مل جاتے تھے ـــ بھگو بھنگی کی سزا ختم ہونے میں صرف چند دن باقی رہ گئے تھے، جب اُس نے آخری بار جرجی کی دی ہوئی بیس بیڑیاں مجھے لا کر دیں۔ میں نے اُس کا شکریہ ادا کیا۔ وہ جیل سے نکلنے پر خوش نہیں تھا۔ میں نے جب اس کو مبارکباد دی تو اُس نے کہا۔

"بابو جی، میں پھر یہاں آ جاؤں گا۔ بھوکے انسان کو چوری کرنی ہی پڑتی ہے ـــ بالکل ایسے ہی جیسے ایک بھوکے انسان کو کھانا کھانا ہی پڑتا ہے ـــ بابو جی آپ بڑے اچھے ہیں، مجھے اتنی بیڑیاں دیتے رہے ـــ خدا کرے آپ کے سارے دوست بری ہو جائیں۔ جرجی بابو آپ کو بہت چاہتے ہیں"

نصیر نے یہ سُن کر غالباً اپنے آپ سے کہا "اور اس کو صرف ساڑھے

تین آنے چُرانے کے جرم میں سزا ملی تھی۔"

رضوی نے گرم کوفی کا ایک گھونٹ پی کر ٹھنڈے انداز میں کہا۔
"جی ہاں صرف ساڑھے تین آنے چُرانے کے جرم میں ۔۔ اور وہ بھی خزانے میں جمع ہیں ۔۔ خدا معلوم اُن سے کس پیٹ کی آگ بجھے گی!"
رضوی نے کوفی کا ایک گھونٹ پیا۔ اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہا "ہاں منٹو صاحب' اُس کی رہائی میں صرف ایک دن رہ گیا تھا۔ مجھے دس روپوں کی اشد ضرورت تھی۔ میں تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ مجھے یہ روپے ایک سلسلہ میں سنتری کو رشوت کے طور پر دینے تھے۔ میں نے بڑی مشکل سے کاغذ پنسل مہیا کر کے جرجی کو ایک خط لکھا تھا اور بھگو کے ذریعہ سے اُس تک بھجوا دیا تھا۔ کہ وہ مجھے کسی نہ کسی طرح دس روپے بھیج دے۔ بھگو اَن پڑھ تھا۔ شام کو وہ مجھ سے ملا۔ جرجی کا رُقعہ اُس نے مجھے دیا۔ اُس میں دس روپے کا سُرخ پاکستانی نوٹ قید تھا۔ میں نے رُقعہ پڑھا۔ یہ لکھا تھا "رضوی پیارے دس روپے بھیج تو رہا ہوں' مگر ایک عادی چور کے ہاتھ' خدا کرے تمہیں مل جائیں کیونکہ یہ کل ہی جیل سے رہا ہو کر جا رہا ہے" میں نے یہ تحریر پڑھی تو بھگو بھنگی کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ اُس کو ساڑھے تین آنے چُرانے کے جرم میں ایک برس کی سزا ہوئی تھی۔ میں سوچنے لگا اگر اس نے دس روپے چُرائے ہوتے تو ساڑھے تین آنے فی برس کے حساب سے اُس کو کیا سزا ملتی۔ ؟"

کی فرشتوں کی راہ ابر نے بند
جو گناہ کیجئے ثواب ہے آج

وہ کچھ دیر ضرور رنج کرے گی۔ لیکن بالآخر خاموش ہو جائے گی اور اس کے کہنے پر قیمے کے پراٹھے بنانا شروع کر دے گی۔

دُکان سے وہ بیس پچیس گز دور گیا ہوگا کہ ایک آدمی نے اس کو سلام کیا۔ نذیر کا حافظہ کمزور تھا۔ اس نے سلام کرنے والے آدمی کو نہ پہچانا' لیکن اس پر یہ ظاہر نہ کیا کہ وہ اس کو نہیں جانتا' چنانچہ بڑے اخلاق سے کہا۔

"کیوں بھئی کہاں رہتے ہو۔ کبھی نظر ہی نہیں آئے؟"

اُس آدمی نے مسکرا کر کہا "حضور میں تو یہیں رہتا ہوں۔ آپ ہی کبھی تشریف نہیں لائے؟"

نذیر نے اس کو پھر بھی نہ پہچانا "میں اب جو تشریف لے آیا ہوں"
"تو چلئے میرے ساتھ"

نذیر اس وقت بڑے اچھے موڈ میں تھا۔

"چلو"

اس آدمی نے نذیر کے ہاتھ میں بوتل دیکھی اور معنی خیز طریقے پر مسکرایا۔
"باقی سامان تو آپ کے پاس موجود ہے"
یہ فقرہ سُن کر نذیر نے فوراً ہی سوچا کہ وہ دلّال ہے۔
"تمہارا نام کیا ہے۔ ؟"

"کریم — آپ بھول گئے تھے!"

نذیر کو یاد آگیا کہ شادی سے پہلے ایک کریم اُس کے لئے اچھی اچھی لڑکیاں لایا کرتا تھا۔ بڑا ایماندار دلاّل تھا۔ اُس کو غور سے دیکھا تو صورت جانی پہچانی معلوم ہوئی۔ پھر پچھلے تمام واقعات اس کے ذہن میں اُبھر آئے۔ کریم سے اُس نے معذرت چاہی۔

"یار میں نے تمہیں پہچانا نہیں تھا۔ میرا خیال ہے۔ غالباً چھ برس ہو گئے ہیں تم سے ملے ہوئے"

"جی ہاں"

"تمہارا اڈہ تو پہلے گرانٹ روڈ کا ناکا ہوا کرتا تھا۔؟"

کریم نے بیڑی سلگائی اور ذرا فخر سے کہا "وہ میں نے چھوڑ دیا ہے آپ کی دعا سے اب یہاں ایک ہوٹل میں دھندا شروع کر رکھا ہے"

نذیر نے اُس کو داد دی "یہ بہت اچھا کیا ہے تم نے۔؟"

کریم نے اور زیادہ فخریہ لہجہ میں کہا "دس چھوکریاں ہیں۔ ایک بالکل نئی ہے"

نذیر نے اُس کو چھیڑنے کے انداز میں کہا "تم لوگ یہی کہا کرتے ہو"

کریم کو بُرا لگا "قسم قرآن کی' میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ سور کھاؤں اگر وہ چھوکری بالکل نئی نہ ہو" پھر اس نے اپنی آواز دھیمی کی اور نذیر کے ساتھ منہ لگا کر کہا "آٹھ دن ہوئے ہیں جب پہلا شخص آیا تھا۔ جھوٹ بولوں تو میرا منہ کالا ہو"

نذیر نے پوچھا "کنواری تھی۔؟"

"جی ہاں۔ دو سو روپے لئے تھے اُس شخص سے"

نذیر نے کریم کی پسلیوں میں ایک ٹھونکا دیا "لو' یہیں بھاؤ تاؤ کرنے لگے"

کریم کو نذیر کی یہ بات پھر بُری لگی "قسم قرآن کی' سؤر ہو جو آپ سے بھاؤ کرے۔ آپ تشریف لے چلئے۔ آپ جو بھی دیں گے مجھے قبول ہو گا۔ کریم نے آپ کا بہت نمک کھایا ہے"

نذیر کی جیب میں ساڑھے چار سو روپے تھے۔ موسم اچھا تھا۔ موڈ بھی اچھا تھا۔ وہ چھ برس پیچھے کے زمانے میں چلا گیا۔ بن بیاہے مسرور تھا۔

"چلو یار آج تمام عیاشیاں رہیں۔ ایک بوتل کا اور بندوبست ہو جانا چاہیئے"

کریم نے پوچھا۔

"آپ کتنے میں لائے ہیں یہ بوتل۔؟"

"پینتیس روپے میں"

"کون سا برانڈ ہے۔؟"

"جونی واکر"

کریم نے چھاتی پر ہاتھ مار کر کہا "میں آپ کو تیس میں لا دوں گا"

نذیر نے دس دس کے تین نوٹ نکالے اور کریم کے ہاتھوں میں دے دیئے "ٹیکسی اور پوچھ پوچھ — یہ لو۔ مجھے وہاں بٹھا کر تم پہلا کام یہی

کرنا۔ تم جانتے ہو میں ایسے موقعوں پر اکیلا نہیں پیا کرتا۔"

کریم مسکرایا "اور آپ کو یاد ہوگا۔ میں ڈیڑھ پگ سے زیادہ نہیں پیا کرتا۔"

نذیر کو یاد آگیا کہ کریم واقعی آج سے چھ برس پہلے صرف ڈیڑھ پگ لیا کرتا تھا۔ یہ یاد کرکے نذیر بھی مسکرایا۔

"آج دو رہیں۔"

"جی نہیں۔ ڈیڑھ سے زیادہ ایک قطرہ بھی نہیں۔"

کریم ایک تھرڈ کلاس بلڈنگ کے پاس ٹھہر گیا۔ جس کے ایک کونے میں چھوٹے سے میلے بورڈ پر "میرینا ہوٹل" لکھا تھا۔ نام تو خوبصورت تھا۔ مگر عمارت نہایت ہی غلیظ تھی۔ سیڑھیاں شکستہ۔ نیچے سود خوار پٹھان بڑی بڑی شلواریں پہنے کھاٹوں پر لیٹے ہوئے تھے۔ پہلی منزل پر کرسچین آباد تھے۔ دوسری منزل پر جہاز کے بے شمار خلاصی۔ تیسری منزل ہوٹل کے مالک کے پاس تھی۔ چوتھی منزل پر کونے کا ایک کمرہ کریم کے پاس تھا جس میں کئی لڑکیاں مرغیوں کی طرح اپنے ڈربے میں بیٹھی تھیں۔

کریم نے ہوٹل کے مالک سے چابی منگوائی۔ ایک بڑا لیکن بے ہنگم سا کمرہ کھولا۔ جس میں لوہے کی ایک چارپائی، ایک کرسی اور ایک تپائی پڑی تھی۔ تین اطراف سے یہ کمرہ کھُلا تھا یعنی بے شمار کھڑکیاں تھیں، جن کے شیشے ٹوٹے ہوئے تھے۔ اور کچھ نہیں، لیکن ہوا کی بہت افراط تھی۔

کریم نے آرام کرسی جو کہ بے حد میلی تھی، ایک اس سے زائد میلے

کپڑے سے صاف کی اور نذیر سے کہا۔

"تشریف رکھئے، لیکن میں یہ عرض کردوں۔ اس کمرے کا کرایہ دس روپے ہوگا۔"

نذیر نے کمرے کو اب ذرا غور سے دیکھا "دس روپے زیادہ ہیں یار۔؟"

کریم نے کہا "بہت زیادہ ہیں، لیکن کیا کیا جائے سالا ہوٹل کا مالک ہی بنیا ہے۔ ایک پیسہ کم نہیں کرتا اور نذیر صاحب موج شوق کرنے والے آدمی بھی زیادہ کی پرواہ نہیں کرتے۔"

نذیر نے کچھ سوچ کر کہا "تم ٹھیک کہتے ہو — کرایہ پیشگی دے دوں۔؟"

"جی نہیں۔ آپ پہلے چھوکری تو دیکھئے۔" یہ کہہ کر وہ اپنے ڈربے میں چلا گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک نہایت ہی شرمیلی لڑکی تھی۔ گھریلو قسم کی ہندو لڑکی سفید دھوتی باندھے تھی۔ عمر چودہ برس کے لگ بھگ ہوگی۔ خوش شکل تو نہیں تھی، لیکن بھولی بھالی تھی۔

کریم نے اس سے کہا "بیٹھ جاؤ۔ یہ صاحب میرے دوست ہیں۔ بالکل اپنے آدمی ہیں۔"

لڑکی نظریں نیچی کئے لوہے کی چارپائی پر بیٹھ گئی۔ کریم یہ کہہ کر چلا گیا۔

"اپنا اطمینان کر لیجئے نذیر صاحب — میں گلاس اور سوڈا لاتا

ہوں "

نذیر آرام کرسی پر سے اُٹھ کر لڑکی کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ سمٹ کر ایک طرف ہٹ گئی۔ نذیر نے اس سے چھ برس پہلے کے انداز میں پوچھا۔

" آپ کا نام۔؟"

لڑکی نے کوئی جواب نہ دیا۔

نذیر نے آگے سرک کر اس کے ہاتھ پکڑے اور پھر پوچھا " آپ کا نام کیا ہے جناب ؟"

لڑکی نے ہاتھ چھڑا کر کہا " شکنتلا "

اور نذیر کو شکنتلا یاد آگئی۔ جس پر راجہ دشنیت عاشق ہوا تھا "میرا نام دشنیت ہے "

نذیر مکمل عیاشی پر تُلا ہوا تھا۔ لڑکی نے اُس کی بات سنی اور مسکرا دی۔ تبھی کریم آگیا۔ اس نے نذیر کو سوڈے کی چار بوتلیں دکھائیں جو ٹھنڈی ہونے کے باعث پسینہ چھوڑ رہی تھیں۔

" مجھے یاد ہے کہ آپ کو روجر کا سوڈا پسند ہے۔ برف میں لگا ہوا لے کر آیا ہوں "

نذیر بہت خوش ہوا " تم کمال کرتے ہو " پھر وہ لڑکی سے مخاطب ہوا " جناب آپ بھی شوق فرمائیں گی۔؟"

لڑکی نے کچھ نہ کہا۔ کریم نے جواب دیا " نذیر صاحب یہ نہیں پیتی۔ آٹھ

دن تو ہوئے ہیں اس کو یہاں آئے ہوئے "

یہ سُن کر نذیر کو افسوس سا ہوا " یہ تو بہت بُری بات ہے "

کریم نے وسکی کی بوتل کھول کر نذیر کے لئے ایک بڑا پگ بنایا اور اس کو آنکھ مار کر کہا۔

" آپ راضی کر لیجئے اسے "

نذیر نے ایک ہی جرعے میں گلاس ختم کیا۔ کریم نے آدھا پگ پیا۔ فوراً ہی اُس کی آواز نشہ آلود ہوگئی۔ ذرا جھوم کر اس نے نذیر سے پوچھا۔ " چھوکری پسند ہے نا آپ کو ؟"

نذیر نے سوچا کہ لڑکی اسے پسند ہے کہ نہیں۔ لیکن۔ لیکن وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ اس نے شکنتلا کی طرف غور سے دیکھا۔ اگر اس کا نام شکنتلا نہ ہوتا تو بہت ممکن ہے وہ اُسے پسند کر لیتا۔ وہ شکنتلا جس پر راجہ دشنیت شکار کھیلتے کھیلتے عاشق ہوا تھا۔ بہت ہی خوبصورت تھی کم از کم کتابوں میں تو یہی درج تھا۔ کہ وہ چندے آفتاب چندے ماہتاب تھی۔ آہو چشم تھی۔ نذیر نے ایک بار پھر اپنی شکنتلا کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھیں بڑی نہیں تھیں۔ آہو چشم تو نہیں تھی' لیکن اس کی آنکھیں اُس کی اپنی آنکھیں تھیں۔ کالی کالی اور بڑی بڑی۔ اُس نے اور کچھ نہ سوچا اور کریم سے کہا " ٹھیک ہے یار —— بولو معاملہ کہاں طے ہوتا ہے۔؟"

کریم نے آدھا پگ اپنے لئے اور انڈیلا اور کہا " سو روپے !"

نذیر نے سوچنا بند کر دیا تھا " ٹھیک ہے۔!"

کریم اپنا دوسرا آدھا پگ پی کر چلا گیا۔ نذیر نے اُٹھ کر دروازہ بند کر دیا۔ شکنتلا کے پاس بیٹھا تو وہ گھبرا سی گئی۔ نذیر نے اُس کو قریب کرنا چاہا تو وہ اُٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ نذیر کو اس کی یہ حرکت ناگوار محسوس ہوئی۔ لیکن اس نے پھر کوشش کی۔ بازو سے پکڑ کر اُس کو اپنے پاس بٹھایا زبردستی اُس کو بھینچا۔ بہت ہی بے کیف سلسلہ تھا۔ البتہ وسکی کا نشہ اچھا تھا۔ وہ اب تک چھ پگ پی چکا تھا اور اس کو افسوس تھا کہ اتنی مہنگی چیز بالکل بے کار گئی ہے۔ اس لئے کہ شکنتلا بالکل الھڑ تھی۔ اُس کو ایسے معاملوں کے آداب کی کوئی واقفیت ہی نہیں تھی۔ نذیر ایک اناڑی تیراک کے ساتھ اِدھر اُدھر بے کار ہاتھ پاؤں مارتا رہا۔ آخر اُکتا گیا۔ دروازہ کھول کر اُس نے کریم کو آواز دی جو اپنے ڈربے میں مرغیوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ آواز سُن کر دوڑا آیا۔

"کیا بات ہے نذیر صاحب۔؟"

نذیر نے بڑی نا اُمیدی سے کہا "کچھ نہیں یار۔ یہ اپنے کام کی نہیں ہے۔؟"

"کیوں۔؟"

"کچھ سمجھتی ہی نہیں"

کریم نے شکنتلا کو الگ لیجا کر بہت سمجھایا۔ مگر وہ نہ سمجھ سکی' شرمائی لجائی' دھوتی سنبھالتی کمرے سے باہر نکل گئی۔ کریم نے اس پر کہا "میں ابھی حاضر کرتا ہوں"

نذیر نے اس کو روکا "جانے دو۔ کوئی اور لے آؤ" لیکن اُس نے فوراً ہی ارادہ بدل لیا "وہ جو تمہیں روپے دیئے تھے' اُس کی بوتل لے آؤ اور شکنتلا کے سوا جتنی لڑکیاں موجود ہیں اُنہیں بھیج دو۔ میرا مطلب ہے جو جیتی ہیں۔ آج اور کوئی سلسلہ نہیں ہوگا۔ اُن کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کروں گا اور بس!"

کریم' نذیر کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اُس نے چار لڑکیاں کمرے میں بھیج دیں نذیر نے ان سب کو سرسری نظر سے دیکھا' کیونکہ وہ اپنے دل میں فیصلہ کر چکا تھا کہ پروگرام صرف پینے کا ہوگا چنانچہ اُس نے ان لڑکیوں کے لئے گلاس منگوائے اور ان کے ساتھ پینا شروع کر دی۔ دوپہر کا کھانا ہوٹل سے منگوا کر کھایا اور شام کے چھ بجے تک اُن لڑکیوں سے باتیں کرتا رہا۔ بڑی فضول قسم کی باتیں' لیکن نذیر خوش تھا۔ جو کوفت شکنتلا نے پیدا کی تھی۔ دور ہوگئی تھی۔

آدھی بوتل باقی تھی' وہ ساتھ لے کر گھر چلا گیا۔ پندرہ روز کے بعد پھر موسم کی وجہ سے اُس کی جی چاہا کہ سارا دن پی جائے۔ سگریٹ والے کی دوکان سے خریدنے کے بجائے اُس نے سوچا کیوں نہ کریم سے ملوں' وہ تیس میں لے دے گا۔ چنانچہ وہ اُس کے ہوٹل میں پہنچا۔ اتفاق سے کریم مل گیا۔ اُس نے ملتے ہی بہت ہولے سے کہا "نذیر صاحب' شکنتلا کی بڑی بہن آئی ہوئی ہے۔ آج صبح کی گاڑی سے پہنچی ہے۔ بہت ہٹیلی ہے مگر آپ اس کو ضرور راضی کر لینگے"

نذیر کچھ سوچ نہ سکا۔ اس نے اپنے دل میں اتنا کہا "چلو دیکھ لیتے ہیں۔"

لیکن اُس نے کریم سے کہا "تم پہلے یار وسکی لے آؤ" یہ کہکر اُس نے تیس روپے جیب سے نکال کر کریم کو دیئے۔

کریم نے نوٹ لے کر نذیر سے کہا "میں لے آتا ہوں۔ آپ اندر کمرے میں بیٹھیے"

نذیر کے پاس صرف دس روپے تھے، لیکن وہ کمرے کا دروازہ کھول کر بیٹھ گیا۔ اُس نے سوچا تھا کہ وسکی کی بوتل لیکر، ایک نظر شکنتلا کی بہن کو دیکھ کر چل دے گا، جاتے وقت دو روپے کریم کو دے دے گا۔

تین طرف سے کھُلے ہوئے ہوادار کمرے میں نہایت ہی میلی کرسی پر بیٹھ کر اُس نے سگرٹ سُلگایا۔ اور اپنی ٹانگیں رکھ دیں۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد آہٹ ہوئی کریم داخل ہوا۔ اُس نے نذیر کے کان کے ساتھ منہ لگا کر ہولے سے کہا۔

"نذیر صاحب آ رہی ہے لیکن آپ ہی رام کیجئے گا اُسے"

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ پانچ منٹ کے بعد ایک لڑکی جس کی شکل و صورت قریب قریب شکنتلا سے ملتی تھی۔ تیوری چڑھائے، شکنتلا کے سے انداز میں سفید دھوتی پہنے کمرے میں داخل ہوئی۔ بڑی بے پروائی سے اُس نے ماتھے کے قریب ہاتھ لیجا کر "آداب" کہا۔ اور لوہے کے پلنگ پر بیٹھ گئی۔ نذیر نے یوں محسوس کیا کہ وہ اُس سے لڑنے آئی ہے۔ چھ برس پیچھے کے زمانے میں ڈبکی لگا کر وہ اس سے مخاطب ہوا "آپ شکنتلا

کی بہن ہیں؟"

اُس نے بڑے تیکھے اور خفگی آمیز لہجے میں کہا "جی ہاں"

نذیر تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔ اس کے بعد اُس لڑکی کو جس کی عمر شکنتلا سے غالباً تین برس بڑی تھی۔ بڑے غور سے دیکھا۔ نذیر کی یہ حرکت اُس کو بہت ناگوار محسوس ہوئی۔ وہ بڑے زور سے ٹانگ ہلا کر اُس سے مخاطب ہوئی۔

"آپ مجھ سے کیا کہنا چاہتے ہیں۔؟"

نذیر کے ہونٹوں پر چھ برس پیچھے کی مُسکراہٹ نمودار ہوئی "جناب آپ اس قدر ناراض کیوں ہیں۔؟"

وہ برس پڑی "میں ناراض کیوں نہ ہوں۔ یہ آپ کا کریم میری بہن کو جے پور سے اُڑا لایا ہے۔ بتائیے آپ میرا خون نہیں کھولے گا۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کو بھی وہ پیش کی گئی تھی۔؟"

نذیر کی زندگی میں ایسا معاملہ کبھی نہیں آیا تھا۔ کچھ دیر سوچ کر اُس نے اس لڑکی سے بڑے خلوص کے ساتھ کہا۔

"شکنتلا کو دیکھتے ہی میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ یہ لڑکی میرے کام کی نہیں۔ بہت الھڑ ہے۔ مجھے ایسی لڑکیاں بالکل پسند نہیں۔ آپ شاید بُرا مانیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں ان عورتوں کو بہت زیادہ پسند کرتا ہوں جو مرد کے سلسلے میں سمجھدار ہوں"

اُس نے کچھ نہ کہا۔ نذیر نے اُس سے دریافت کیا۔

"آپ کا نام ۔ ؟"

شکنتلا کی بہن نے مختصراً کہا "شاردا"

نذیر نے پھر اس سے پوچھا "آپ کا وطن ۔ ؟"

"جے پور"۔ اس کا لہجہ بہت تیکھا اور خفگی آلود تھا۔

نذیر نے مسکرا کر اس سے کہا "دیکھئے، آپ کو مجھ سے ناراض ہونے کا کوئی حق نہیں۔ کریم نے اگر کوئی زیادتی کی ہے تو آپ اس کو سزا دے سکتی ہیں، لیکن میرا کوئی قصور نہیں" یہ کہکر وہ اٹھا اور اس کو اچانک اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر بھینچ لیا۔ وہ کچھ کہنے بھی نہ پائی تھی کہ نذیر اس سے مخاطب ہوا "یہ قصور البتہ میرا ہے۔ اس کی سزا میں بھگتنے کے لئے تیار ہوں"

لڑکی کے ماتھے پر بیشمار تبدیلیاں نمودار ہوئیں۔ اس نے تین چار مرتبہ زمین پر تھوکا۔ غالباً گالیاں دینے والی تھی، لیکن چپ ہوگئی۔ اٹھ کھڑی ہوئی تھی لیکن فوراً ہی بیٹھ گئی۔ نذیر نے چاہا کہ وہ کچھ کہے۔

"بتائیے، آپ مجھے کیا سزا دینا چاہتی ہیں"

وہ کچھ کہنے والی تھی کہ ڈربے سے کسی بچے کے رونے کی آواز آئی۔ لڑکی اٹھی نذیر نے اسے روکا۔

"کہاں جا رہی ہیں آپ ۔ ؟"

وہ ایکدم ماں بن گئی "منی رو رہی ہے دودھ کے لئے" یہ کہکر وہ چلی گئی۔

نذیر نے اس کے بارے میں سوچنے کی کوشش کی مگر کچھ سوچ نہ سکا اتنے میں کریم وسکی کی بوتل اور سوڈے لیکر آگیا۔ اس نے نذیر کے لئے پیگ بنا ڈالا۔ اپنا گلاس ختم کیا۔ اور نذیر سے رازدارانہ لہجے میں پوچھا۔

"کچھ باتیں ہوئیں شاردا سے ـــــ میں نے تو سمجھا تھا کہ آپ نے راضی کر لیا ہوگا۔"

نذیر نے مسکرا کر جواب دیا "بڑی غصیلی عورت ہے"

"جی ہاں ـــ صبح آئی ہے، میری جان کھا گئی ہے۔ آپ ذرا اس کو رام کریں ـــــ شکنتلا خود یہاں آئی تھی۔ اس لئے کہ اس کا باپ اس کی ماں کو چھوڑ چکا ہے۔ اور اس شاردا کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ اس کا پتی شادی کے فوراً بعد ہی اس کو چھوڑ کر خدا معلوم کہاں چلا گیا تھا۔ اب اکیلی اپنی بچی کے ساتھ ماں کے پاس رہتی ہے۔ آپ منا لیجئے نا اس کو ۔"

نذیر نے اس سے کہا "منانے کی کیا بات ہے ؟"

کریم نے اس کو آنکھ ماری "سالی مجھے تو مانتی نہیں۔ جب سے آئی ہے ڈانٹ رہی ہے"

اتنے میں شاردا اپنی ایک سال کی بچی کو گود میں اٹھائے اندر کمرے میں آئی۔ کریم کو اس نے غصے سے دیکھا۔ اس نے آدھا پیگ پیا اور باہر چلا گیا۔ منی کو بہت زکام تھا۔ ناک بہت بری طرح بہہ رہی تھی۔ نذیر نے کریم کو بلایا اور اس کو پانچ کا نوٹ دیکر کہا۔

شاردا کے پاس بیٹھ گیا۔

"آپ کو اِس سے نفرت ہے۔ کیوں۔؟"

شاردا نے مختصر سا جواب دیا: "بس ہے۔"

"تو آج سے نہیں رہے گی — یہ لیجئے۔" یہ کہہ کر اُس نے گلاس شاردا کی طرف بڑھا دیا۔

"میں ہرگز نہیں پیوں گی۔"

"میں کہتا ہوں، تم ہرگز انکار نہیں کرو گی۔"

شاردا نے گلاس پکڑ لیا۔ تھوڑی دیر تک اس کو عجیب نگاہوں سے دیکھتی رہی، پھر نذیر کی طرف مظلومانہ نگاہوں سے دیکھا۔ اور ناک انگلیوں سے بند کر کے سارا گلاس غٹاغٹ پی گئی۔ قے آنے کو تھی مگر اس نے روک لی۔ دھوتی کے پلّو سے اپنے آنسو پونچھ کر اُس نے نذیر سے کہا۔

"یہ پہلی اور آخری بار ہے — لیکن میں نے کیوں پی۔؟"

نذیر نے اُس کے گیلے ہونٹ چومے اور کہا: "یہ مت پوچھئے۔" یہ کہہ کر اُس نے دروازہ بند کر دیا۔

شام کو سات بجے اُس نے دروازہ کھولا۔ کریم آیا تو شاردا نظریں جھکائے باہر چلی گئی۔ کریم بہت خوش تھا۔ اُس نے نذیر سے کہا: "آپ نے کمال کر دیا۔ آپ سو تو نہیں، پچاس دیدیجئے۔"

نذیر شاردا سے بے حد مطمئن تھا۔ اس قدر مطمئن کہ وہ گزشتہ تمام عورتوں کو بھول چکا تھا۔ اُس نے کریم سے کہا۔

"جاؤ ایک وسکی کی بوتل لے آؤ۔"

کریم نے پوچھا: "وہ کیا ہوتی ہے۔؟"

نذیر نے اس سے کہا: "زکام کی دوا ہے۔" یہ کہہ کر اُس نے ایک پرزے پر اس دوا کا نام لکھ دیا۔ "کسی بھی اسٹور سے مل جائے گی۔"

"جی اچھا۔" کہہ کر کریم چلا گیا۔ نذیر مُنّی کی طرف متوجہ ہوا۔ اُس کو بچے بہت اچھے لگتے تھے۔ مُنّی خوش شکل نہیں تھی۔ لیکن کم سِنی کے باعث نذیر کے لئے دل کش تھی۔ اُس نے اُس کو گود میں لیا۔ ماں سے سو نہیں رہی تھی سر میں ہولے ہولے انگلیاں پھیر کر اس کو سُلا دیا۔ اور شاردا سے کہا۔

"اس کی ماں تو میں ہوں۔"

شاردا مُسکرائی: "لایئے میں اس کو اندر چھوڑ آؤں۔"

شاردا اُس کو اندر لے گئی اور چند منٹ کے بعد واپس آ گئی۔ اب اُس کے چہرے پر غصّے کے آثار نہیں تھے۔ نذیر اس کے پاس بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر وہ خاموش رہا۔ اس کے بعد اس نے شاردا سے پوچھا: "کیا آپ مجھے اپنا چچی بننے کی اجازت دے سکتی ہیں۔"

اور اُس کے جواب کا انتظار کئے بغیر اس کو اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا۔ شاردا نے غصّے کا اظہار نہ کیا۔ "جواب دیجئے جناب۔؟"

شاردا خاموش رہی۔ نذیر نے اُٹھ کر ایک پگ پیا، تو شاردا نے ناک سکوڑ کر اُس سے کہا: "مجھے اس چیز سے نفرت ہے۔"

نذیر نے ایک پگ گلاس میں ڈالا۔ اس میں سوڈا حل کر کے اُٹھایا اور

کے اس کمرے میں شاردا کے ساتھ رہا ــــــ جب گھر لوٹا تو وہ بے حد مطمئن تھا پہلے روز سے بھی زیادہ مطمئن۔ شاردا اپنی واجبی شکل و صورت اور کم گوئی کے باوجود اس کے شہوانی حواس پر چھا گئی تھی۔ نذیر بار بار سوچتا تھا ــــــ

"یہ کیسی عورت ہے ــــــ میں نے اپنی زندگی میں ایسی خاموش مگر جسمانی طور پر ایسی پُرگو عورت نہیں دیکھی"

نذیر نے ہر دوسرے دن شاردا کے پاس جانا شروع کر دیا۔ اُس کو روپے پیسے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ نذیر ساٹھ روپے کریم کو دیتا تھا۔ دس روپے ہوٹل والا لے جاتا تھا۔ باقی پچاس میں سے تقریباً تیرہ روپے کریم اپنی کمیشن کے وضع کر لیتا تھا۔ مگر شاردا نے اس کے متعلق نذیر سے کبھی ذکر نہیں کیا تھا۔

دو مہینے گذر گئے۔ نذیر کے بجٹ نے جواب دیدیا۔ اس کے علاوہ اُس نے بڑی شدّت سے محسوس کیا کہ شاردا اُس کی ازدواجی زندگی میں بہت بُری طرح حائل ہو رہی ہے۔ وہ بیوی کے ساتھ سوتا ہے تو اس کو ایک کمی محسوس ہوتی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اُس کے بجائے شاردا ہو۔ یہ بہت بُری بات تھی۔ نذیر کو چونکہ اس کا احساس تھا۔ اس لئے اس نے کوشش کی کہ شاردا کا سلسلہ کسی نہ کسی طرح ختم ہو جائے۔ چنانچہ اُس نے شاردا ہی سے کہا۔

"شاردا میں شادی شدہ آدمی ہوں۔ میری جتنی جمع پونجی تھی ختم

"میں کل ادا کر دوں گا ــــ ہوٹل کا کرایہ بھی کل چکا دوں گا۔ آج میرے پاس وسکی منگانے کے بعد صرف دس روپے باقی تھے"

کریم نے کہا "کوئی واندہ نہیں ہے ــــ میں تو اس بات سے بہت خوش ہوں کہ آپ نے شاردا سے معاملہ طے کر لیا ــــ حضور، میری جان کھا گئی تھی۔ اب لنکستلا سے وہ کچھ نہیں کہہ سکتی"

کریم چلا گیا۔ شاردا آئی۔ اُس کی گود میں بچّی تھی۔ نذیر نے اُس کو پانچ روپے دیئے۔ لیکن شاردا نے انکار کر دیا۔ اس پر نذیر نے اُس سے مسکرا کر کہا۔

"میں اس کا باپ ہوں ـ تم یہ کیا کر رہی ہو"

شاردا نے روپے لے لئے۔ بڑی خاموشی کے ساتھ۔ شروع شروع میں وہ بہت باتونی معلوم ہوتی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ باتوں کے دریا بہا دے گی۔ مگر اب وہ بات کرنے سے بھی گریز کرتی تھی۔ نذیر نے اُس کی بچّی کو گود میں لیکر پیار کیا اور جاتے وقت شاردا سے کہا "لو بھئی شاردا، میں چلا، کل نہیں تو پرسوں ضرور آؤں گا"

لیکن نذیر دوسرے روز ہی آگیا۔ شاردا کے جسمانی خلوص نے اس پر جادو سا کر دیا تھا۔ اُس نے کریم کو پچھلے روپے ادا کئے۔ ایک بوتل منگوائی اور شاردا کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اُس کو پینے کے لئے کہا تو وہ بولی "میں نے کہہ دیا تھا کہ وہ پہلا اور آخری پیگ تھا"

نذیر اکیلا پیتا رہا۔ صبح گیارہ بجے سے وہ شام کے سات بجے تک ہوٹل

ہوگئی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا میں کیا کروں۔ تمہیں چھوڑ بھی نہیں سکتا، حالانکہ چاہتا ہوں کہ ادھر کا کبھی رُخ نہ کروں۔"

شاردا نے یہ سُنا تو خاموش ہوگئی۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد کہا: "جتنے روپے میرے پاس ہیں آپ لے سکتے ہیں۔ صرف مجھے جے پور کا کرایہ دے دیجئے تاکہ میں شکنتلا کو لیکر واپس چلی جاؤں۔"

نذیر نے اُس کا پیار لیا اور کہا: "بکواس نہ کرو — تم میرا مطلب نہیں سمجھیں۔ بات یہ ہے کہ میرا روپیہ بہت خرچ ہوگیا ہے۔ بلکہ یوں کہو کہ ختم ہوگیا ہے۔ میں یہ سوچتا ہوں کہ تمہارے پاس کیسے آسکوں گا۔"

شاردا نے کوئی جواب نہ دیا۔ نذیر ایک دوست سے قرض لیکر جب دوسرے روز ہوٹل میں پہنچا تو کریم نے بتایا کہ وہ جے پور جانے کے لئے تیار بیٹھی ہے۔ نذیر نے اُس کو بُلایا۔ مگر وہ نہ آئی۔ کریم کے ہاتھ اُس نے بہت سے نوٹ بھجوائے اور یہ کہا۔

"آپ یہ روپے لے لیجئے — اور مجھے اپنا ایڈریس دے دیجئے۔"

نذیر نے کریم کو اپنا ایڈریس لکھ کر دے دیا اور روپے واپس کر دیئے۔ شاردا آئی۔ گود میں مُنّی تھی۔ اُس نے آداب عرض کیا اور کہا۔ "میں آج شام کو جے پور جا رہی ہوں۔"

نذیر نے پوچھا: "کیوں۔؟"

شاردا نے یہ مختصر جواب دیا۔ "مجھے معلوم نہیں۔" اور یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔

نذیر نے کریم سے کہا کہ اُسے بُلا کر لائیے۔ مگر وہ نہ آئی۔ نذیر چلا گیا۔

اُس کو یوں محسوس ہوا کہ اُس کے بدن کی حرارت چلی گئی ہے۔ اس کے سوال کا جواب چلا گیا ہے۔

وہ چلی گئی' واقعی چلی گئی۔ کریم کو اس کا بہت افسوس تھا۔ اس نے نذیر سے شکایت کے طور پر کہا: "نذیر صاحب آپ نے کیوں اس کو جانے دیا۔؟"

نذیر نے اس سے کہا: "بھائی' میں کوئی سیٹھ تو ہوں نہیں — ہر دوسرے روز پچاس ایک' دس ہوٹل کے' تیس بوتل کے' اور راؤپر کا خرچ علیحدہ۔ میرا تو دیوالہ پٹ گیا ہے — خدا کی قسم مقروض ہوگیا ہوں۔"

یہ سُن کر کریم خاموش ہوگیا۔ نذیر نے اس سے کہا: "بھئی میں مجبور تھا۔ کہاں تک یہ قصہ چلاتا۔"

کریم نے کہا: "نذیر صاحب اُس کو آپ سے محبت تھی۔"

نذیر کو معلوم نہیں تھا کہ محبت کیا ہوتی ہے۔ وہ فقط اتنا جانتا تھا کہ شاردا میں جسمانی خلوص ہے۔ وہ اس کے مردانہ سوالات کا بالکل صحیح جواب ہے۔ اس کے علاوہ وہ شاردا کے متعلق اور کچھ نہیں جانتا تھا۔ البتہ اُس نے مختصر الفاظ میں اُس سے یہ ضرور کہا تھا کہ اُس کا خاوند عیاش تھا اور اس کو صرف اس لئے چھوڑ گیا تھا۔ کہ دو برس تک اُس کے ہاں اولاد نہیں ہوئی تھی — لیکن جب وہ اُس سے علیحدہ ہوا تو نو مہینے کے بعد مُنّی پیدا ہوئی جو بالکل اپنے باپ پر ہے۔

شکنتلا کو وہ اپنے ساتھ لے گئی۔ وہ اس کا بیاہ کرنا چاہتی تھی۔ اُس کی خواہش تھی کہ وہ شریفانہ زندگی بسر کرے۔ کریم نے نذیر کو بتایا تھا کہ وہ اس

سے بہت محبت کرتی ہے۔ کریم نے بہت کوشش کی تھی کہ شکنتلا سے پیشہ کرائے۔ کئی شخص آتے تھے۔ وہ دو سو روپے دینے کے لئے تیار تھے۔ مگر شاردا نہیں مانتی تھی، کریم سے لڑنا شروع کر دیتی تھی۔ کریم اس سے کہتا تھا: "تم کیا کر رہی ہو۔؟"

وہ جواب دیتی: "اگر تم بیچ میں نہ ہوتے تو میں ایسا کبھی نہ کرتی۔ نذیر صاحب کا ایک پیسہ خرچ نہ ہونے دیتی۔"

شاردا نے نذیر سے ایک بار اُس کا فوٹو مانگا تھا۔ جو اُس نے گھر سے لاکر اُس کو دیدیا تھا۔ یہ وہ اپنے ساتھ جیپور لے گئی تھی۔ اُس نے نذیر سے کبھی محبت کا اظہار نہیں کیا تھا۔ جب دونوں بستر پر لیٹے ہوتے تو وہ بالکل خاموش رہتی۔ نذیر اس کو بولنے پر اُکساتا، مگر وہ کچھ نہ کہتی۔ لیکن نذیر اس کے جسمانی خلوص کا قائل تھا۔ جہاں تک اس بات کا تعلق تھا۔ وہ اخلاص کا مجسمہ تھی۔

وہ چلی گئی، نذیر کے سینے کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ کیونکہ وہ اس کی گھریلو زندگی میں بہت بُری طرح حائل ہو گئی تھی۔ اگر وہ کچھ دیر اور رہتی تو بہت ممکن تھا کہ نذیر اپنی بیوی سے بالکل غافل ہو جاتا۔ کچھ دن گذرے تو وہ اپنی اصلی حالت پر آنے لگا۔ شاردا کا جسمانی لمس اُس کے جسم سے آہستہ آہستہ دور ہونے لگا۔

ٹھیک پندرہ دن کے بعد جبکہ نذیر گھر میں بیٹھا دفتر کا کام کر رہا تھا۔ اُس کی بیوی نے صبح کی ڈاک لاکر اُسے دی۔ سارے خط وہی کھولا کرتی

تھی۔ ایک خط اُس نے کھولا اور دیکھ کر نذیر سے کہا۔

"معلوم نہیں گجراتی ہے یا ہندی۔"

نذیر نے خط لیکر دیکھا۔ اُس کو معلوم نہ ہو سکا کہ ہندی ہے یا گجراتی۔ الگ ٹرے میں رکھ دیا اور کام میں مشغول ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد نذیر کی بیوی نے اپنی چھوٹی بہن نعیمہ کو آواز دی۔ وہ آئی تو وہ خط اُٹھا کر اُسے دیا۔

"ذرا پڑھو تو کیا لکھا ہے۔ تم تو ہندی اور گجراتی پڑھ سکتی ہو۔"

نعیمہ نے خط دیکھا اور کہا "ہندی ہے۔" اور یہ کہہ کر پڑھنا شروع کیا۔ "جے پور — پریتے نذیر صاحب" اتنا پڑھ کر وہ رُک گئی۔ نذیر چونکا۔ نعیمہ نے ایک سطر اور پڑھی: "آداب۔ آپ تو مجھے بھول چکے ہوں گے۔ مگر جب سے میں یہاں آئی ہوں۔ آپ کو یاد کرتی رہتی ہوں۔" نعیمہ کا رنگ سُرخ ہو گیا۔ اُس نے کاغذ کا دوسرا رُخ دیکھا: "کوئی شاردا ہے۔"

نذیر اُٹھا۔ جلدی سے اُس نے نعیمہ کے ہاتھ سے خط لیا اور اپنی بیوی سے کہا: "خدا معلوم کون ہے — میں باہر جا رہا ہوں — اس کو پڑھا کر اُردو میں لکھوا لاؤں گا۔" اُس نے بیوی کو کچھ کہنے کا موقع ہی نہ دیا اور چلا گیا۔ ایک دوست کے پاس جا کر اُس نے شاردا کے خط جیسے کاغذ منگوائے اور ہندی میں ویسی ہی روشنائی سے ایک خط لکھوایا۔ پہلے فقرے وہی رکھے۔ مضمون یہ تھا کہ بمبئی سنٹرل پر شاردا اس سے ملی تھی۔ اُس کو اتنے بڑے مصوّر سے مل کر بہت خوشی ہوئی تھی وغیرہ وغیرہ۔

شام کو گھر آیا تو اس نے نیا خط اپنی بیوی کو دیا۔ اور اُردو کی نقل پڑھ کر سُنا دی۔ بیوی نے شاردا کے متعلق اس سے دریافت کیا تو اس نے کہا۔ "عرصہ ہوا میں ایک دوست کو چھوڑنے گیا تھا۔ شاردا کو یہ دوست جانتا تھا۔ وہاں پلیٹ فارم پر میرا تعارف ہُوا۔ مصوّری کا اُسے بھی شوق تھا۔"

بات آئی گئی ہو گئی۔ لیکن دوسرے روز شاردا کا ایک اور خط آ گیا۔ اُس کو بھی نذیر نے اُسی طریقے سے گول کیا۔ اور فوراً شاردا کو تار دیا کہ وہ خط لکھنا بند کر دے اور اس کے نئے پتے کا انتظار کرے۔ ڈاک خانے جا کر اس نے متعلقہ پوسٹ مین کو تاکید کر دی کہ جے پور کا خط وہ اپنے پاس رکھے صبح آ کر وہ اس سے پوچھ لیا کرے گا۔ تین خط اُس نے اس طرح وصول کئے۔ اس کے بعد شاردا اُس کو اس کے دوست کے پتے سے خط بھیجنے لگی۔

شاردا بہت کم گو تھی، لیکن خط بہت لمبے لکھتی تھی۔ اس نے نذیر کے سامنے کبھی اپنی محبت کا اظہار نہیں کیا تھا، لیکن خط اس اظہار سے پُر ہوتے تھے۔ گلے، شکوے، ہجر و فراق، اس قسم کی عام باتیں جو عشقیہ خطوں میں ہوتی ہیں۔

نذیر کو شاردا سے وہ محبت نہیں تھی۔ جس کا ذکر افسانوں اور ناولوں میں ہوتا ہے، اس لئے اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کہ وہ جواب میں کیا لکھے، اس لئے یہ کام اس کا دوست ہی کرتا تھا ہندی میں جواب لکھ کر وہ نذیر کو سُنا دیتا تھا اور نذیر کہہ دیتا تھا۔

"ٹھیک ہے۔"

شاردا بمبئی آنے کے لئے بے قرار تھی۔ لیکن وہ کریم کے پاس نہیں ٹھیرنا چاہتی تھی۔ نذیر اُس کی رہائش کا اور کہیں بندوبست نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ مکان ان دنوں ملتے ہی نہیں تھے۔ اُس نے ہوٹل کا سوچا۔ مگر خیال آیا، ایسا نہ ہو راز فاش ہو جائے، چنانچہ اُس نے شاردا کو لکھوایا کہ وہ ابھی کچھ دیر انتظار کرے۔

اتنے میں فرقہ وارانہ فساد شروع ہو گئے۔ بٹوارے سے پہلے عجیب افراتفری مچی تھی۔ اس کی بیوی نے کہا کہ وہ لاہور جانا چاہتی ہے۔ میں کچھ دیر وہاں رہوں گی اگر حالات ٹھیک ہو گئے تو واپس آ جاؤں گی، ورنہ آپ بھی وہیں چلے آئیے گا۔

نذیر نے کچھ دیر اُسے روکا۔ مگر جب اُس کا بھائی لاہور جانے کے لئے تیار ہوا تو وہ اور اس کی بہن اُس کے ساتھ چلی گئیں۔ اور وہ اکیلا رہ گیا اُس نے شاردا کو سرسری طور پر لکھا کہ وہ اب اکیلا ہے۔ جواب میں اس کا تار آیا کہ وہ آ رہی ہے۔ اس تار کے مضمون کے مطابق وہ جے پور سے چل پڑی تھی۔ نذیر بہت سٹپٹایا۔ مگر اس کا جسم بہت خوش تھا۔ وہ شاردا کے جسم کا خلوص چاہتا تھا۔ وہ دن بھر سے مانگتا تھا۔ جب وہ شاردا کے ساتھ ہوتا تھا۔ صبح گیارہ بجے سے لیکر شام کے سات بجے تک۔ اب روپے کے خرچ کا سوال نہیں تھا۔ کریم بھی نہیں تھا .... ہوٹل بھی نہیں تھا۔ اُس نے سوچا: میں اپنے نوکر کو رازدار بنا لوں گا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ دس پندرہ روپے اس کا منہ بند کر دیں گے۔ میری بیوی

واپس آئی تو وہ اُس سے کچھ نہیں کہے گا۔"

دوسرے روز وہ اسٹیشن پہنچا۔ فرنٹیئر میل آئی مگر شاردا تلاش کے باوجود اُسے نہ ملی۔ اُس نے سوچا شاید کسی وجہ سے رُک گئی ہے۔ دوسرا تار بھیجے گی۔

اس سے اگلے روز وہ حسبِ معمول صبح کی ٹرین سے اپنے دفتر روانہ ہوا۔ وہ جہاں کشتی اُترتا تھا۔ گاڑی وہاں رُکی تو اُس نے دیکھا کہ پلیٹ فارم پر شاردا کھڑی ہے۔ اس نے زور سے پُکارا۔

"شاردا۔!"

شاردا نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا "نذیر صاحب!"

"تم یہاں کہاں۔؟"

شاردا نے شکایتاً کہا "آپ مجھے لینے نہ آئے تو میں یہاں آپ کے دفتر پہنچی۔ پتہ چلا کہ آپ ابھی تک نہیں آئے۔ یہاں پلیٹ فارم پر اب آپ کا انتظار کر رہی تھی"

نذیر نے کچھ دیر سوچ کر اس سے کہا "تم یہاں ٹھیرو۔ میں دفتر سے چھٹی لیکر ابھی آتا ہوں"

شاردا کو بنچ پر بٹھا کر نذیر جلدی جلدی دفتر گیا۔ ایک عرضی لکھ کر دی۔ چپراسی کو دے آیا اور شاردا کو اپنے گھر لے گیا۔ راستہ میں دونوں نے کوئی بات نہ کی۔ لیکن اُن کے جسم آپس میں گفتگو کرتے رہے۔ ایک دوسرے کی طرف کھنچتے رہے۔

گھر پہنچ کر نذیر نے شاردا سے کہا "تم نہا لو۔ میں ناشتے کا بندوبست کراتا ہوں"

شاردا نہانے لگی۔ نذیر نے نوکر سے کہا "کہ اُس کے ایک دوست کی بیوی آئی ہے۔ جلدی ناشتہ تیار کر دے۔ اُس سے یہ کہہ کر نذیر نے الماری سے بوتل نکالی۔ ایک پگ جو دو کے برابر تھا گلاس میں اُنڈیلا اور پانی میں ملا کر پی گیا۔ وہ اسی ہوٹل والے ڈھنگ سے شاردا سے اختلاط چاہتا تھا۔

شاردا نہا دھو کر باہر نکلی اور ناشتہ کرنے لگی۔ اُس نے اِدھر اُدھر کی بے شمار باتیں کیں۔ نذیر نے محسوس کیا جیسے وہ بدل گئی ہے۔ وہ پہلے بہت کم گو تھی۔ اکثر خاموش رہتی تھی۔ مگر اب وہ بات بات پر اپنی محبت کا اظہار کرتی تھی۔ نذیر نے سوچا "یہ محبت کیا ہے۔ اگر یہ اس کا اظہار نہ کرے تو کتنا اچھا ہے۔ مجھے اس کی خاموشی زیادہ پسند تھی۔ اُس کے ذریعے مجھ تک بہت سی باتیں پہنچ جاتی تھیں، مگر اب اُس کو جانے کیا ہو گیا ہے۔ باتیں کرتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے اپنے عشقیہ خط پڑھ کر سُنا رہی ہے"

ناشتہ ختم ہوا تو نذیر نے ایک پگ تیار کیا۔ اور شاردا کو پیش کیا، لیکن اس نے انکار کر دیا۔ نذیر نے اصرار کیا تو شاردا نے اس کو خوش کرنے کی خاطر ناک بند کر کے وہ پگ پی لیا۔ بُرا سا منہ بنایا۔ پانی لیکر کُلی کی۔ نذیر کو افسوس سا ہوا کہ شاردا نے کیوں پی۔ اس کے اصرار پر بھی انکار کیا ہوتا تو زیادہ اچھا تھا۔ مگر اس نے اس کے بارے میں زیادہ غور نہ کیا۔ نوکر کو

بہت دوڑ رایک کام پر بھیجا۔ دروازہ بند کیا۔ اور بستر پر لیٹ گیا۔

"تم نے لکھا تھا کہ وہ دن پھر کب آئیں گے۔ لو آگئے ہیں۔ پھر وہی دن' بلکہ راتیں بھی۔ اِن دنوں راتیں نہیں ہوتی تھیں صرف دن ہوتے تھے۔ ہوٹل کے میلے کچیلے دن۔ یہاں ہر چیز اُجلی ہے۔ ہر چیز صاف ہے۔ ہوٹل کا کرایہ بھی نہیں —— کریم بھی نہیں —— یہاں ہم اپنے مالک آپ ہیں۔

شاردا نے اپنے فراق کی باتیں شروع کر دیں۔ یہ زمانہ اُس نے کیسے کاٹا۔ وہی کتابوں اور افسانوں والی فضول باتیں۔ گِلے، شکوے، آہیں۔ راتیں تارے گن گن کر کاٹنا۔ نذیر نے ایک اور پگ پیا اور سوچا۔ "کون تارے گنتا ہے۔ گن کیسے سکتا ہے اتنے سارے تاروں کی —— بالکل فضول ہے' بے ہودہ بکواس ہے"

یہ سوچتے ہوئے اُس نے شاردا کو اپنے قریب کر لیا۔ بستر صاف تھا۔ شاردا صاف تھی۔ وہ خود صاف تھا کمرے کی فضا بھی صاف تھی۔ لیکن کیا وجہ تھی نذیر کے دل و دماغ پر وہ کیفیت طاری نہیں ہوتی تھی جو اس غلیظ ہوٹل میں لوہے کی چارپائی پر شاردا کی قربت میں ہوتی تھی۔

نذیر نے سوچا شاید اس نے کم پی ہے۔ اُٹھ کر اُس نے ایک پگ بنایا اور ایک جرعے میں ختم کر کے وہ پھر لیٹ گیا۔ شاردا نے پھر وہی لاکھ مرتبہ کہی ہوئی باتیں شروع کر دیں۔ وہی ہجر و فراق کی باتیں۔ وہی گِلے، شکوے۔ نذیر اکتا گیا اور اس اکتاہٹ نے اُس کے جسم کو کند کر دیا۔

اُس کو محسوس ہونے لگا کہ شاردا کی سان گھس کر بے کار ہو گئی ہے۔ اس کے جسم کے جذبات اب وہ تیز نہیں کر سکتی۔ لیکن وہ پھر بھی دیر تک لیٹا رہا۔

فارغ ہوا تو اُس کا جی چاہا کہ ٹیکسی پکڑے اور اپنے گھر چلا جائے' اپنی بیوی کے پاس' مگر جب اُس نے سوچا کہ وہ تو اپنے گھر میں ہے اور اس کی بیوی لاہور میں تو دل ہی دل میں بہت جھنجھلایا۔ اُس کو یہ خواہش ہوئی کہ اس کا گھر ہوٹل بن جائے۔ وہ دس روپے کرائے کے دے کریم کو پچاس روپے ادا کرے اور چلا جائے۔

شاردا کے جسم کا خلوص بدستور برقرار تھا۔ مگر وہ فضا نہیں تھی۔ وہ سودے بازی نہیں تھی۔ اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے والی بات نہیں تھی۔ ہوٹل کی وہ غلاظت نہیں تھی۔ یہ سب چیزیں مل ملا کر جو ایک ماحول بناتی تھیں۔ وہ نہیں تھا۔ نذیر اپنے گھر میں تھا۔ اُس بستر پر تھا جس پر اُس کی سادہ لوح بیوی اُس کے ساتھ سوتی تھی۔ یہ احساس اُس کے تحت الشعور میں تھا' اسی لئے وہ سمجھ نہ سکتا تھا کہ معاملہ کیا ہے کبھی وہ یہ سوچتا تھا کہ وسکی خراب ہے۔ کبھی یہ سوچتا تھا کہ شاردا نے التفات نہیں برتا۔ اور کبھی یہ خیال کرتا تھا کہ وہ خاموش رہتی تو سب ٹھیک ہوتا۔ پھر وہ یہ سوچتا اتنی دیر کے بعد ملی ہے۔ دل کی بھڑاس تو نکالنا تھی بے چاری کو' ایک دو دن میں ٹھیک ہو جائے گی' وہی پرانی شاردا بن جائیگی۔

پندرہ دن گذر گئے' مگر نذیر کو شاردا' وہ پرانی ہوٹل والی شاردا

محسوس نہ ہوئی۔ اس کی بچی بے پور میں تھی۔ ہوٹل میں وہ اس کے ساتھ ہوتی تھی۔ نذیر اس کے زکام کے لئے، اس کی پھنسیوں کے لئے، اس کے گلے کے لئے دوائیں منگوایا کرتا تھا۔ اب یہ چیز نہیں تھی۔ وہ بالکل اکیلی تھی۔ نذیر اس کو اور اس کی منی کو بالکل ایک سمجھتا تھا۔

ایک بار شاردا کی دودھ سے بھری ہوئی چھاتیوں پر دباؤ ڈالنے کے باعث نذیر کے بالوں بھرے سینے پر دودھ کے کئی قطرے چمٹ گئے تھے۔ اور اس نے ایک عجیب قسم کی لذت محسوس کی تھی۔ اس نے سوچا تھا، ماں بننا کتنا اچھا ہے —— اور یہ دودھ، مردوں میں یہ کتنی بڑی کمی ہے کہ وہ کھا پی کر سب ہضم کر جاتے ہیں۔ عورتیں کماتی ہیں اور کھلاتی بھی ہیں —— کسی کو پالنا۔ اپنے بچے ہی کو سہی کتنی شاندار چیز ہے۔"

اب منی، شاردا کے ساتھ نہیں تھی۔ وہ نامکمل تھی۔ اس کی چھاتیاں بھی نامکمل تھیں۔ اب ان میں دودھ نہیں تھا۔ وہ سفید سفید آبِ حیات۔ نذیر اب اس کو اپنے سینے کے ساتھ بھینچتا تھا تو وہ اس کو منع نہیں کرتی تھی۔ شاردا، اب وہ شاردا نہیں تھی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ شاردا وہی شاردا تھی، بلکہ اس سے کچھ زیادہ تھی۔ یعنی اتنی دیر جدا رہنے کے بعد اس کا جسمانی خلوص تیز ہو گیا تھا۔ وہ روحانی طور پر بھی نذیر کو چاہتی تھی۔ لیکن نذیر کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ شاردا میں اب وہ پہلی کشش یا جو بھی کچھ تھا نہیں رہا۔

پندرہ دن لگاتار اس کے ساتھ گذارنے پر وہ اسی نتیجے پر پہنچا تھا۔

پندرہ دن دفتر سے غیر حاضری بہت کافی تھی۔ اس نے اب دفتر جانا شروع کر دیا۔ صبح اٹھ کر دفتر جاتا اور شام کو لوٹتا۔ شاردا نے بالکل بیویوں کی طرح اس کی خدمت شروع کر دی۔

بازار سے اون خرید کر اس کے لئے ایک سویٹر بن دیا۔ شام کو دفتر سے آتا تو اس کے لئے سوڈے منگوا کر رکھے ہوتے۔ برف، تھرموس میں ڈالی ہوتی۔ صبح اٹھ کر اس کا شیو کا سامان میز پر رکھتی۔ پانی گرم کرا کے اس کو دیتی۔ وہ شیو کر چکتا تو سارا سامان صاف کرتی۔ گھر کی صفائی کراتی۔ خود جھاڑو دیتی۔ نذیر اور بھی زیادہ اکتا گیا۔

رات کو وہ اکٹھے سوتے تھے۔ مگر اب اس نے یہ بہانہ کیا کہ وہ کچھ سوچ رہا ہے۔ اس لئے اکیلا سونا چاہتا ہے۔ شاردا دوسرے پلنگ پر سونے لگی۔

مگر یہ نذیر کے لئے ایک اور الجھن ہو گئی۔ وہ گہری نیند سوئی ہوتی اور وہ جاگتا رہتا۔ اور سوچتا کہ آخر یہ سب کچھ ہے کیا۔ یہ شاردا یہاں کیوں ہے؟ —— کریم کے ہوٹل میں اس نے اس کے ساتھ چند دن بڑے اچھے گذارے تھے۔ مگر یہ اس کے ساتھ کیوں چمٹ گئی ہے، آخر اس کا انجام کیا ہوگا —— محبت وغیرہ سب بکواس ہے، جو ایک چھوٹی سی بات تھی وہ اب نہیں رہی۔ اس کو واپس جے پور جانا چاہیئے۔

چھ دنوں کے بعد اس نے یہ محسوس کرنا شروع کیا کہ وہ گناہ کر رہا

ہے۔ وہ کریم کے ہوٹل میں بھی کرتا تھا۔ اس نے شادی سے پہلے بھی ایسے بے شمار گناہ کئے تھے۔ مگر ان کا اس کو احساس ہی نہیں تھا لیکن اب اس نے بڑی شدت سے محسوس کرنا شروع کیا تھا کہ وہ اپنی بیوی سے بے وفائی کر رہا ہے۔ اپنی سادہ لوح بیوی سے جس کو اس نے کئی بار شاردا کے خطوں کے سلسلے میں چکمہ دیا تھا۔ شاردا اب اور بھی زیادہ پُرکشش ہو گئی۔ وہ اس سے روکھا برتاؤ کرنے لگا، مگر اس کے التفات میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ اتنا جانتی تھی کہ آرٹسٹ لوگ موجی ہوتے ہیں۔ اسی لئے وہ اس سے اس کی بے التفاتی کا گلا نہیں کرتی تھی۔

پورا ایک مہینہ ہو گیا۔ جب نذیر نے دن گنے تو اس کو بہت اُلجھن ہوئی۔

"یہ عورت کیا پورا ایک مہینہ یہاں رہی ہے — میں کس قدر ذلیل آدمی ہوں — جیسے مجھے اس کا بہت خیال ہے۔ جیسے اس کے بغیر میری زندگی اجیرن ہے۔ میں کتنا بڑا فراڈ ہوں۔ اُدھر اپنی بیوی سے غداری کر رہا ہوں۔ اِدھر شاردا سے۔ میں کیوں اس سے صاف صاف نہیں کہہ دیتا کہ بھئی اب مجھے تم سے لگاؤ نہیں رہا۔ — لیکن سوال یہ ہے کہ مجھے لگاؤ نہیں رہا یا شاردا میں وہ پہلی سی بات نہیں رہی ہے؟"

وہ اس کے متعلق سوچتا۔ مگر اُسے کوئی جواب نہ ملتا۔ اس کے ذہن

میں عجیب افراتفری پھیلی تھی۔ وہ اب اخلاقیات کے متعلق سوچتا تھا۔ بیوی سے جو وہ غداری کر رہا تھا، اس کا احساس ہر وقت اس پر غالب رہتا تھا۔ کچھ دن اور گزرے تو یہ احساس اور بھی زیادہ شدید ہو گیا اور نذیر کو خود سے نفرت ہونے لگی — میں بہت ذلیل ہوں۔ یہ عورت میری دوسری بیوی کیوں بن گئی ہے۔ مجھے اس کی کب ضرورت تھی۔ یہ کیوں میرے ساتھ چپک گئی ہے۔ میں نے کیوں اس کو یہاں آنے کی اجازت دی۔ جب اس نے تار بھیجا تھا، لیکن وہ تار ایسے وقت پر ملا تھا کہ میں اس کو روک ہی نہیں سکتا تھا۔"

پھر وہ سوچتا کہ شاردا جو کچھ کرتی ہے، بناوٹ ہے۔ وہ اس کو اس بناوٹ سے اپنی بیوی سے جُدا کرنا چاہتی ہے۔ اس سے اس کی نظروں میں شاردا اور بھی گر گئی۔ اُس سے نذیر کا سلوک اور زیادہ روکھا ہو گیا۔ اس روکھے پن کو دیکھ کر شاردا بہت زیادہ مُلائم ہو گئی۔ اُس نے نذیر کے آرام و آسائش کا زیادہ خیال رکھنا شروع کر دیا۔ لیکن نذیر کو اس کے اس رویے سے بہت اُلجھن ہوتی۔ وہ اس سے بے حد نفرت کرنے لگا۔

ایک دن اس کی جیب خالی تھی۔ بینک سے روپے نکلوانے اس کو یاد نہیں رہے تھے۔ دفتر بہت دیر سے گیا، اس لئے کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ جاتے وقت شاردا نے اس سے کچھ کہا تو وہ اس پر برس پڑا۔

"بکواس نہ کرو۔ میں ٹھیک ہوں۔ بینک سے روپے نکلوانے بھول گیا ہوں اور سگریٹ میرے سارے ختم ہیں۔"

دفتر کے پاس دوکان سے اُس کو گولڈ فلیک کا ڈبہ ملا۔ یہ سگریٹ اس کو ناپسند تھے۔ مگر اُدھار مل گئے تھے۔ اس لئے دو تین مجبوراً پینے پڑے۔ شام کو گھر آیا تو دیکھا تپائی پر اس کا من بھاتا سگریٹ کا ڈبہ پڑا ہے۔ خیال کیا کہ خالی ہے۔ پھر سوچا شاید ایک دو اس میں پڑے ہوں۔ کھول کر دیکھا تو بھرا ہوا تھا۔ شاردا سے پوچھا۔

"یہ ڈبہ کہاں سے آیا۔؟"

شاردا نے مسکرا کر جواب دیا۔ "اندر الماری میں پڑا تھا۔"

نذیر نے کچھ نہ کہا۔ اُس نے سوچا' شاید میں نے کھول کر اندر الماری میں رکھ دیا تھا۔ اور بھول گیا۔ لیکن دوسرے دن پھر تپائی پر سالم ڈبہ موجود تھا۔ نذیر نے جب شاردا سے اس کی بابت پوچھا تو اُس نے مسکرا کر وہی جواب دیا۔

"اندر الماری میں پڑا تھا۔"

نذیر نے بڑے غصے کے ساتھ کہا۔ "شاردا' تم بکواس کرتی ہو۔ تمہاری یہ حرکت مجھے پسند نہیں۔ میں اپنی چیزیں خود خرید سکتا ہوں۔ میں بھکاری نہیں ہوں۔ جو تم میرے لئے ہر روز سگریٹ خرید اکرو۔"

شاردا نے بڑے پیار سے کہا۔ "آپ بھول جاتے ہیں' اسی لئے میں نے دو مرتبہ گستاخی کی۔"

نذیر نے بے وجہ اور زیادہ غصے سے کہا۔ "میرا دماغ خراب ہے — لیکن مجھے یہ گستاخی ہرگز پسند نہیں۔"

شاردا کا لہجہ بہت ہی ملائم ہو گیا۔ "میں آپ سے معافی مانگتی ہوں۔"

نذیر نے ایک لحظے کے لئے خیال کیا کہ شاردا کی کوئی غلطی نہیں — اُسے آگے بڑھ کر باہوں میں سمیٹ لینا چاہیے۔ اس لئے کہ وہ اس کا اتنا خیال رکھتی تھی۔ مگر فوراً ہی اُس کو اپنی بیوی کا خیال آیا کہ وہ غداری کر رہا تھا۔ چنانچہ اس نے شاردا سے بڑے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

"بکواس نہ کرو۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں کل یہاں سے روانہ کر دوں۔ کل صبح تمہیں جتنے روپے درکار ہوں گے دے دوں گا۔" لیکن یہ کہہ کر نذیر نے محسوس کیا جیسے وہ بڑا کمینہ اور رذیل ہے۔

شاردا نے کچھ نہ کہا۔ رات کو وہ نذیر کے ساتھ سوئی۔ ساری رات اُس سے پیار کرتی رہی۔ نذیر کو اس سے اُلجھن ہوتی رہی مگر اس نے شاردا پر اس کا اظہار نہ کیا۔ صبح اُٹھا تو ناشتے پر بے شمار لذیذ چیزیں تھیں۔ پھر بھی اُس نے شاردا سے کوئی بات نہ کی۔ فارغ ہو کر وہ سیدھا بنک گیا۔ جانے سے پہلے اس نے شاردا سے صرف اتنا کہا۔

"میں بنک جا رہا ہوں۔ ابھی واپس آتا ہوں۔"

بنک کی وہ شاخ جس میں نذیر کا روپیہ جمع تھا بالکل نزدیک تھی۔

وہ دو سَو روپے نکلوا کر فوراً ہی واپس آگیا۔ اُس کا ارادہ تھا کہ وہ سب روپیہ شاردا کے حوالے کر دے گا۔ اور اس کو ٹکٹ وغیرہ لیکر رخصت کر دے گا۔ مگر جب وہ گھر پہنچا تو اس کے نوکر نے بتایا کہ وہ چلی گئی ہے۔ اُس نے پُوچھا۔

: کہاں۔ ؟

نوکر نے بتایا "جی مجھ سے اُنھوں نے کچھ نہیں کہا۔ اپنا ٹرنک اور بستر ساتھ لے گئی ہیں!"

نذیر اندر کمرے میں آیا تو اُس نے دیکھا کہ تپائی پر اس کے پسندیدہ سگرٹوں کا ڈبہ پڑا ہے بھرا ہوا۔!

"حجامت"

"میری تو آپ نے زندگی حرام کر رکھی ہے۔ خدا کرے میں مر جاؤں"

"اپنے مرنے کی دعائیں کیوں مانگتی ہو۔ میں مر جاؤں تو سارا قصّہ پاک ہو جائے گا۔ کہو تو میں ابھی خودکشی کرنے کے لئے تیار ہوں، یہاں پاس ہی افیم کا ٹھیکہ ہے ایک تولہ افیم کافی ہوگی"

"جاؤ۔ سوچتے کیا ہو۔ ؟"

"جاتا ہوں — تم اُٹھو اور مجھے ...... معلوم نہیں ایک تولہ افیم کتنے میں آتی ہے تم مجھے اندازاً دس روپے دے دو"

"دس روپے۔ ؟"

"ہاں بھئی —— اپنی جان گنوانی ہے —— دس روپے زیادہ تو نہیں"

"میں نہیں دے سکتی"

"ضرور آپ کو افیم کھا کے ہی مرنا ہے۔ ؟"

"سنکھیا بھی ہو سکتا ہے"

"کتنے میں آئے گی ۔ ؟"

"معلوم نہیں ـــــ میں نے آج تک کبھی سنکھیا نہیں کھائی"

"آپ کو ہر چیز کا علم ہے سنتے کیوں ہیں ۔ ؟"

"بنا تم مجھے رہی ہو ـــ بھلا مجھے زہروں کی قیمتوں کے متعلق کیا علم ہو سکتا ہے"

"آپ کو ہر چیز کا علم ہے"

"تمہارے متعلق تو میں ابھی تک کچھ بھی جان نہ سکا"

"اس لئے کہ آپ نے میرے متعلق کبھی سوچا ہی نہیں"

"یہ صریحاً تمہاری زیادتی ہے ـــــ پانچ برس ہو گئے ہیں تم ان میں سے کوئی ایسا دن پیش کرو جب میں نے تمہارے متعلق نہ سوچا ہو"

"ہٹائیے ان پانچ برسوں کے جتنے دن ہوتے ہیں ان میں آپ مجھ سے یہی خرافات کہتے رہے ہیں"

"تم حقیقت کو خرافات کہتی ہو ؟ ـــ میں اب کیا کہوں"

"جو کہنا چاہتے ہیں کہہ ڈالئے ـــــ آپ کی زبان میں لگام ہی کہاں ہے"

"پھر تم نے بدزبانی شروع کر دی"

"بدزبان تو آپ ہیں"

"میں نے ان پانچ برسوں میں، آپ سر بر قرآن اُٹھا کر کہیئے کب اس

قسم کی گستاخی کی ہے"

"گستاخ ہوں گے آپ کے......"

"رُک کیوں گئی ہو ـــ جو کہنا چاہتی ہو کہہ دو"

"میں کچھ کہنا نہیں چاہتی ـــــ آپ سے کوئی کیا کہے ـــــ آپ تو یہ چاہتے ہیں کہ آدمی کو تکلیف پہونچے لیکن وہ اُف بھی نہ کرے، میں تو ایسی زندگی سے گھبرا گئی ہوں"

"تم چاہتی کیا ہو ۔ یہ بھی پتہ چلے ۔ ؟"

"میں کچھ نہیں چاہتی"

"پھر یہ گلے شکوے کیا معنیٰ رکھتے ہیں ۔ ؟"

"ان کے معنی آپ بخوبی سمجھتے ہیں ـــ انجان کیوں بنتے ہیں ۔ ؟ ان گلے شکووں کے پیچھے کوئی بات تو ہو گی"

"کیا ۔ ؟"

"میں کیا جانوں ۔ ؟"

"یہ عجیب منطق ہے ـــ خود ہی پھاڑتی ہو خود ہی رفو کرتی ہو ـــــ جو صحیح بات ہے اس کو بتاتی کیوں نہیں ہو ۔ میری سمجھ میں نہیں آتا یہ ہر روز کے جھگڑے ہمیں کہاں لے جائیں گے"

"جہنم میں"

"وہاں بھی تو ہمارا ساتھ ہو گا"

"میں تو وہاں بالکل نہیں جاؤں گی"

“تو کہاں ہو گی تم۔؟”

“مجھے معلوم نہیں”

“تمہیں بہت سی باتیں معلوم نہیں ہوتیں ——— سب سے بڑی بات میری محبت ہے جس کا احساس تمہیں ابھی تک نہیں ہوا ——— میری سمجھ میں نہیں آتا ——— یا میں نے اس کے اظہار میں بخل کیا ہے۔ یا تم میں وہ حس نہیں جو اس جذبے کو پہچان سکے”

“اصل میں بے حس تو آپ ہیں”

“کیسے۔؟”

“یہ بھی کوئی بات ہے ان پانچ برسوں میں ہر روز...... ہر روز....؟”

“یہی تو میری محبت کا ثبوت ہے۔”

“لعنت ہے ایسی محبت پر کہ آدمی تنگ آ جائے”

“محبت سے کون تنگ آ سکتا ہے”

“میری مثال موجود ہے”

“اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے اقرار کیا ہے کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں”

“میں نے کب اقرار کیا ہے۔؟”

“یہ اقرار ہی تو تھا”

“ہو گا۔!”

“ہرگز نہیں، تھا، لیکن تم مانو گی نہیں۔ اس لئے کہ ضدی ہو، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ عورتوں کی نفسیات کیا ہیں۔ جب ان سے پیار کیے

جائے تو گھبرا جاتی ہیں اور جب ان سے ذرا بے اعتنائی برتی جائے تو برہم ہو جاتی ہیں”

“محض بکواس ہے”

“اس لئے کہ یہ پُرخلوص خاوند کی زبان سے نکلی ہے۔؟”

“ہٹایئے ——— آپ کا خلوص میں دیکھ چکی ہوں”

“جب دیکھ چکی ہو تو ایمان کیوں نہیں لاتی ہو۔؟”

“مجھے تنگ نہ کیجئے۔ میری طبیعت خراب ہے مجھے کوئی چیز اچھی نہیں لگتی ——— !”

“اپنے کو بھی اچھا نہیں سمجھتیں۔؟”

“خدا کی قسم ——— آج نہیں”

“کل تو اچھا سمجھو گی؟”

“مجھے کچھ معلوم نہیں”

“یہ عجیب بات ہے کہ تمہیں سب کچھ معلوم ہوتا ہے ——— مگر تمہیں معلوم نہیں ہوتا ——— یہ کیا سلسلہ ہے ——— تم صاف الفاظ میں یہ کیوں نہیں کہہ دیتیں کہ تم مجھ سے نفرت کرتی ہو”

“تو سن لیجئے ——— میں آپ سے نفرت کرتی ہوں”

“مجھے یہ سن کر بڑا دکھ ہوا ہے ——— میں نے تمہاری ہر آسائش کا خیال رکھا ہے”

“لیکن ایک بات کا خیال نہیں رکھا”

"کس بات کا ۔ ؟"

"آپ عقل مند ہیں خود سمجھئے ۔۔۔ میں کیوں بتاؤں ۔"

"کوئی اشارہ تو کردو ۔"

"میں ایسی اشارہ بازیاں نہیں جانتی ۔"

"تم نے ایسی گفتگو کہاں سے سیکھی ہے ۔ ؟"

"آپ سے ۔"

"مجھ سے ؟ ۔ مجھے حیرت ہے کہ یہ الزام تم نے مجھ پر کیوں لگایا ہے ۔ ؟"

"آپ پر تو ہر الزام لگ سکتا ہے ۔"

"مثال کے طور پر ۔ ؟"

"میں آپ کو مثال نہیں دے سکتی ۔۔۔ خدا کے لئے یہ گفتگو بند کیجئے میں تنگ آگئی ہوں ۔ بس، میں نے کہہ دیا ہے کہ مجھے ......"

"کیا ۔ ؟"

"یا اللہ میری توبہ ۔۔۔ مجھے زیادہ تنگ نہ کیجئے ۔۔۔ میرا جی چاہتا ہے اپنے سر کے بال نوچنا شروع کردوں ۔"

"میرا سر موجود ہے ۔ تم اس کے بال بڑے شوق سے نوچ سکتی ہو ۔"

"آپ کو تو اپنے بال بڑے عزیز ہیں ۔"

"انسان کو اپنی ہر چیز عزیز ہوتی ہے ۔"

"لیکن مردوں کے سر پر بالوں کے چھتے بھڑوں کے چھتے معلوم ہوتے ہیں ۔۔۔۔۔۔ آپ معلوم نہیں بال کٹوانے سے پرہیز

کیوں کرتے ہیں ۔ ؟"

"میں پرہیزی آدمی ہوں ۔"

"اس قدر جھوٹ ۔۔۔ ابھی پرسوں آپ نے مجھ سے کہا کہ آپ نے ایک پارٹی میں شراب پی تھی ۔"

"لاحول ولا ۔۔۔ میں نے تو صرف شیری کا ایک گلاس پیا تھا ۔"

"وہ کیا بلا ہوتی ہے ۔ ؟"

"بڑی بے ضرر قسم کی چیز ہے ۔ تمہاری بدزبانیاں کہیں مجھے بھی بدزبان نہ بنا دیں ۔"

"جیسے آپ بدزبان نہیں ہیں ۔"

"بدزبان تمہارا باپ تھا ۔۔۔ جانتی ہو ۔ وہ ہر بات میں مغلظات بکتا تھا ۔"

"میں کہتی ہوں میرے موئے باپ کے متعلق کچھ نہ کہئے ۔۔۔ آپ بڑے واہیات ہوتے جارہے ہیں ۔"

"واہیات کیسے ہوتا جارہا ہوں ۔ ؟"

"میں نہیں جانتی ۔"

"جانے بغیر تم نے یہ فتویٰ کیسے عاید کردیا ؟"

"میں یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ آپ نے اپنے اتنے بال کیوں بڑھا رکھے ہیں مجھے وحشت ہوتی ہے ۔"

"بس اتنی سی بات تھی جس کو تم نے بتنگڑ بنا دیا ۔۔۔۔۔۔ میں جا رہا

ہوں "

"کہاں — ؟"

"بس جا رہا ہوں "

"خدا کے لئے مجھے بتا دیجئے — میں خودکشی کر لوں گی "

"میں نصرت ہیئر کٹنگ سیلون میں جا رہا ہوں "

جنٹل مینوں کا بُرش !

یہ غالباً آج سے بیس برس پیچھے کی بات ہے۔ میری عمر یہی کوئی بائیس برس کے قریب ہوگی۔ یا شاید اس سے دو برس کم کیونکہ تاریخوں اور سنوں کے معاملہ میں میرا حافظہ بالکل صفر ہے۔ میری دوستی کا حلقہ ان نوجوانوں پر مشتمل تھا جو عمر میں مجھ سے کافی بڑے تھے۔

حفیظ پینٹر کی دوکان میں جو بجلی والے چوک کے بائیں ہاتھ ہال بازار کے پاس ہی واقع تھی۔ ہم سب بیٹھتے اور گھنٹوں گپ بازی ہوتی رہتی۔ میں پڑھائی وڑھائی قریب قریب چھوڑ چکا تھا۔ اسی طرح مبارک اپنی ملازمت پر لات مار کر امرتسر واپس چلا آیا تھا۔ وہ کسی ریاست میں ملازم تھا۔ حفیظ پینٹر کی اپنے باپ سے بچ ہو گئی تھی اس لئے اس نے علیحدہ ایک بڑی دوکان جس میں کچھ عرصہ پہلے ایک کیمونسٹ سکھ کی دوکان تھی۔ جو گراموفون ڈیلر تھا۔ چھوڑ کر خیر دین کی مسجد سے ملحقہ دوکان میں جو ہال بازار میں تھی۔ مگر اچھے موقع پر تھی۔ یعنی عین ہال بازار کے وسط میں اور مسجد کے زیر سایہ خرابات

مروجہ اصولوں کے ماتحت ہونی ہی چاہیئے۔ اس لئے وہ اسے بہت پسند آگئی تھی۔ اُدھر اذان ہوتی تو ادھر ریکارڈ بجتے۔ لیکن کوئی دنگا فساد اس بات پر وہاں کبھی نہ ہوا۔ البتہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر سینکڑوں خون ہوتے رہتے۔

امرود پرستی پر۔ رنڈی بازی پر۔ غنڈوں کی دو مخالف پارٹیوں پر۔ ایسے مسلم مسلم اور مسلم ہندو فساد عام تھے۔ جو ایک دو دن اپنی دھاک بٹھا کر جھاگ کے مانند غائب ہو جاتے۔ گرمی کی پیلی پیلی بھروں کی مانند جو اپنے اردگرد جالا تن لیتی ہیں۔ اور بظاہر بالکل مردہ ہو جاتی ہیں لیکن معلوم نہیں۔ پھر موافق موسم آ جانے پر زندہ ہو جاتی ہیں اور بیقصور آدمیوں کے کاٹنے کے شغل میں مصروف ہو جاتی ہیں۔

امرتسر ایک عجیب و غریب شہر ہے۔ یہاں ہر ایک قسم کی شے اس زمانے میں پائی جاتی تھی۔ بھنگیوں کی لڑائی سے لیکر گورنمنٹ سے پنجہ کشی کرنے تک۔ لوگ بھی بھانت بھانت کے تھے۔ کچھ ایسے منچلے تھے جو چھوٹے چھوٹے پٹاخے بنا کر چلاتے تھے کہ لوگوں کے دل ایک لحظے کے لئے دہل جاتے۔ وحشت پسند بھی تھے۔ اور امن پسند بھی۔ نمازی اور پرہیزگار بھی تھے۔ اور اوّل درجے کے اوباش اور گناہ گار بھی۔ مسجدیں تھیں اور مندر بھی۔ ان میں گناہ کے کام بھی ہوتے تھے اور ثواب کے بھی۔

غرضیکہ انسانی زندگی کے یہ سب دھارے ساتھ ساتھ متواتر بہا کرتے تھے۔۔۔ کئی سیاسی تحریکیں ہوئیں۔ کئی غنڈوں کا آپس میں کشت و خون ہوا۔ مسلمانوں اور قادیانیوں میں کئی مباحثے ہوئے۔ جن میں بڑے جغادری

علمائے کرام نے حصہ لیا۔ قحط پڑے۔ وبائیں آئیں۔ جلیان والا کا تاریخی حادثہ ہوا، ہزاروں انسان جن میں مسلمان، سکھ، ہندو سب شامل تھے۔ موت کے گھاٹ اتارے گئے۔ لیکن امرتسر جوں کا توں رہا۔

حفیظ پینٹر کی دوکان پریوں تو دنیا بھر کے سیاسی، مجلسی اور معاشی مسائل پر تبادلہ خیالات اور بحث ہوتی رہتی، مگر بڑے خام انداز میں۔ اصل میں وہ سب کے سب آرٹسٹ تھے۔ گو نیم رس۔۔۔ ان کو اصل میں موسیقی سے شغف تھا۔ کوئی طبلے کی جوڑی اٹھا لاتا، کوئی ستار، کوئی سارنگی اور کوئی تانپورہ ہاتھ میں لیکر میاں کی ٹوڈی، مالکونس یا بھاگیسری کا الاپ شروع کر دیتا۔

یہاں بھنگ کبھی گھوٹی جاتی، چرس بھرے سگریٹ بھی پیئے جاتے۔ شراب کے دور اکثر چلتے، اس لئے کہ دن اتنا بڑا بے باک نہیں تھا۔۔۔ ساڑھے آٹھ روپے میں ایک پوری بوتل بڑھیا۔۔۔ بڑھیا اسکاچ وسکی کی آ جاتی تھی۔ حفیظ شام کو اپنی دوکان کے بھاری بھرکم کواڑ بند کر دیتا اور ہم چٹائیوں پر بیٹھ کر اس مشروب سے آہستہ آہستہ لطف اندوز ہوتے، پھر آدھی رات کو جب آس پاس کی ساری دوکانیں بند ہوتیں، ہم موسیقی کا دور شروع کر دیتے۔

یہاں قریب قریب سب گویئے، بڑے اور چھوٹے، فن کا مظاہرہ کر چکے تھے۔ اس لئے کہ زندہ دل نوجوانوں کی محفل تھی۔ جھگڑا بازی بھی ہوتی تو کوئی بُرا نہ مانتا تھا۔

ایک دن میں صبح دس بجے کے قریب حفیظ پینٹر کی دوکان کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ اس لئے کہ مجھے ذرا آگے چل کر ایک کیمسٹ کی دوکان

میں نے اس سے کہا "چلو اس کا تماشہ بھی دیکھ لیں گے ـــــ پر اگر اس نے آج رات کوئی مچھر نہ مارا تو یہ طے ہے کہ تمہارے آرٹ اسٹڈیو سے وہ زندہ باہر نہیں نکلے گا"

حفیظ کھلکھلا کر ہنسا، کان میں سے اڑسا ہوا برُش نکالا اور سائن بورڈ پینٹ کرنے لگا۔

"جاؤ یار جاؤ ـــــ میرا وقت ہرج کر رہے ہو ـــــ مجھے یہ کام وقت پر مکمل کرنا ہے"

میں وہاں سے چلا گیا ـــ کیمسٹ کی دوکان سے دوائی لی۔ باہر نکلا تو شیخ صاحب جو وہاں کے بہت بڑے رئیس تھے۔ ان سے ایک آدمی دوکان کے پاس کھڑا باتیں کر رہا تھا۔ میں نے شیخ صاحب کو سلام کیا ـــ انہوں نے جیسا کہ ان کی عادت تھی چھڑی بجلی کے کھمبے کے ساتھ ماری۔ جب آواز پیدا ہوئی تو ان کا اطمینان ہو گیا۔ تو وہ مجھ سے مخاطب ہوئے۔

"کہو بھئی سعادت کیا حال ہے"

میں نے عرض کیا "جناب کی دُعا سے سب ٹھیک ہے"

جو آدمی شیخ صاحب سے باتیں کر رہا تھا وہ سیاہ فام تھا۔ لیکن اچکن کا رنگ ان کے رنگ سے کہیں زیادہ کالا۔

دُبلا پتلا، لیکن چہرے کے نقش تیکھے، شیخ صاحب چلنے لگے تو اس آبنوسی گوشت پوست کے ٹکڑے نے تیزی سے بڑھ کر شیخ صاحب کے کوٹ کی

سے اپنے کان کے لئے دوا لینا تھی۔ کہ حفیظ نے برُش کان میں اُڑس کر مجھے باوازِ بلند پکارا۔ اور اسی کان میں اُڑسے ہوئے برُش کو نکال کر اس نے مجھے اشارہ کیا۔ جس کا یہ مطلب تھا کہ میں اس کی بات سُنتا جاؤں۔

میں اس کی دوکان کے تھڑے کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اور اس سے پوچھا۔

"کیا بات ہے حفیظ صاحب۔؟"

حفیظ نے پھر برُش کان میں اُڑس لیا اور جواب دیا "بات یہ ہے میری جان کہ آج توکل کا گانا ہو گا۔ اس کے ساتھ مچھر خاں اور بیبے خاں بھی ہوں گے ـــــ وہ معاملہ بھی ہو گا ـــــ چھ بجے سے پہلے پہلے ہی آجانا ـــــ میں نے تمام دوستوں کو اطلاع دے دی ہے ـ توکل کو میں نے سُنا تو نہیں۔ لیکن نئے خیال کے لوگ اسے بہت پسند کر رہے ہیں۔ نوجوان ہیں۔ کہتے ہیں کہ خان صاحب عاشق کی مانند بے ڈھر گاتا ہے اور حق ادا کرتا ہے"

میں بہت خوش ہوا "آؤں گا اور ضرور آؤں گا۔ مگر یہ مچھر خاں کیا بلا ہے۔ کیا تم اسے کسی مچھر دانی کے اندر بٹھاؤ گے۔؟"

حفیظ پینٹر کھلکھلا کر ہنسا "ارے نہیں یار، اس کی عادت ہے کہ جب کوئی تان لیتا ہے اور واپس مدھم پر آتا ہے۔ تو بڑے زور سے اپنی رانوں پر دو ہتڑ مارتا ہے ـــ اس لئے اس کا نام مچھر خاں پڑ گیا ہے۔ جیسے وہ گا نہیں رہا بلکہ اپنے بدن پر کاٹنے والے مچھر مار رہا ہے"

پیٹھ جھاڑنی شروع کی۔ بڑی نفاست سے' شیخ صاحب نے گھما کر اس سے پوچھا۔

"کیا بات تھی۔؟"

اس آبنوسی آدمی نے بڑی پتلی آواز میں جواب دیا۔ "چند بال تھے اور تھوڑی سی گرد۔"

شیخ صاحب نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ "اچھا تم کل صبح گھر پہ آنا۔" اور وہ پھر بجلی کے کھمبے کو اپنی چھڑی سے بچاتے ہوئے غالباً کمپنی باغ کی طرف نکل گئے۔

ایک دن میں نے پھر اسے دیکھا۔ اپنے کپڑے کے بازار میں وہ دو لالوں کی مصاحبی میں مصروف تھا۔ اس نے صاف ستھرے کوٹوں پر سے کئی مرتبہ غیر مرئی چیزیں جدا کیں۔ اس دن بھی وہ اپنی کالی اچکن پہنے تھا۔ حالانکہ کالے کپڑے پر گرد و غبار فوراً نمایاں ہوتا ہے؛ مگر میں نے غور سے دیکھا' کہ ان پر ایسی کوئی چیز بھی نہیں تھی۔ میرا خیال ہے وہ جنٹل مینوں کے برش کے علاوہ اپنا برش خود بھی تھا۔ مجھے راستہ میں ایک دوست مل گیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"یہ آبنوسی آدمی کون ہے۔؟"

اس نے حیرت سے پوچھا "کون سا آبنوسی آدمی — بن مانس سنے تھے' مگر آبنوسی کہاں سے تم نے گھڑ لیا۔؟"

میں نے اس سے ذرا تیز لہجے میں کہا "ارے یہ آدمی جو ہمارے

آگے آگے جا رہا ہے — چغد ہو پرلے درجے کے۔ کیا اتنا بھی نہیں جانتے کہ آبنوس ایک لکڑی ہوتی ہے۔"

"تو کیا یہ لکڑی ہے جو چل پھر رہی ہے۔؟"

"ابے نہیں — آبنوس کا رنگ کالا ہوتا ہے' چونکہ اس نے کالی اچکن پہنی ہے۔ اور رنگ بھی اس کا خدا کے فضل و کرم سے خاصا کالا ہے۔ تو میں نے اسے آبنوسی آدمی کہہ دیا۔"

میرا دوست ہنسا "ارے' تم اسے نہیں جانتے' اس کا نام جنٹل مینوں کا برش ہے۔"

"اتنا تو میں جانتا ہوں۔"

"تو اس سے زیادہ تم اور کیا جاننا چاہتے ہو۔؟"

میں نے چڑ کر کہا "یہی کہ اس کا محل وقوع کیا ہے — اس کا پیشہ کیا ہے۔؟"

میرا دوست مسکرایا "یہ ذات کا ربابی ہے جو دربار صاحب میں چوکی کرتے ہیں — مگر یہ وہاں نہیں جاتا۔"

"کیوں۔؟"

"بس اس کو امیروں کی صحبت ہے۔ ان ہی میں اٹھتا بیٹھتا ہے۔ اور ان کے کوٹوں پر برش کرتا رہتا ہے۔"

میں نے اس سے پوچھا "کھاتا پیتا کہاں سے ہے۔؟"

جواب ملا "جن کی مصاحب داری کرتا ہے — اس کے علاوہ گاتا

بہت اچھا ہے "

میں نے پوچھا "تم نے کبھی سُنا ہے اس کو۔ ؟"

"نہیں البتہ تعریف بہت سُنی ہے "

ہم باتوں میں مشغول پیچھے رہ گئے اور وہ جنٹل مینوں کا آبنوسی برش ان دو لالوں کے کوٹ جھاڑتا بہت دور نکل گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد میرا دوست بھی مجھ سے جُدا ہو گیا۔ اس کو کوئی ضروری کام تھا۔ ورنہ میں اس شخص کے متعلق کچھ اور معلومات حاصل کرتا۔

اتفاق سے مجھے اپنے بہنوئی (جو امرتسر کے آنریری مجسٹریٹ تھے اور خدا معلوم کیا کیا تھے) کے ساتھ ایک تقریب پر جانا پڑا۔ اب مجھے اچھی طرح یاد نہیں کہ وہ تقریب تھی جو نئے ڈپٹی کمشنر کے تقرر کے سلسلے میں تھی۔ وہ شخص کالی وہی اچکن پہنے معزز اور رئیس لوگوں کے ارد گرد چکر لگا رہا تھا۔ اس نے بلا مبالغہ آدھے گھنٹے کے اندر اندر چُن چُن کر کئی رؤسا کے کوٹ صاف کئے۔ اپنی پتلی پتلی انگلیوں سے کسی کے کالر پر سے اس نے بال اُٹھائے۔ کسی کے کوٹ کی پیٹھ پر سے ——— بعضوں کے کوٹوں کو، جب اس کی سمجھ میں نہ آیا وہ گرد اپنے سفید رومال سے جھاڑ دی۔ اور ہر ایک سے شکریہ وصول کیا۔

بڑی جرأت سے کام لے کر وہ ڈپٹی کمشنر بہادر کے پاس بھی

جا پہنچا۔ اور اس کی پتلون صاف کر دی۔ وہ انگریز تھا اس نے جنٹل مینوں کے بُرش کا تہ دل سے شکریہ ادا کیا۔

اس کے بعد ایک رات جبکہ ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ اور حفیظ پینٹر کی دوکان میں ہم معشوق علی فوٹو گرافر سے اس کا گانا سُن کر محظوظ ہو رہے تھے۔ اور ساتھ ساتھ وسکی بھی پی رہے تھے۔ کہ اچانک ——— دوکان کا پھاٹک نما دروازہ کھُلا اور جنٹل مینوں کا بُرش نمودار ہوا۔ اس نے ہم سب سے مخاطب ہو کر کہا۔

"میں ادھر سے گذر رہا تھا کہ گانے کی آواز سُنائی دی ———
ماشاءاللہ بڑی سُریلی تھی ——— ہے تو یہ تہذیب کے خلاف کہ میں بن بلائے چلا آیا ——— اگر آپ کی اجازت ہو تو کیا تھوڑی دیر کے لئے آپ کی محفل میں شریک ہو سکتا ہوں "

حفیظ پینٹر اور معشوق علی فوٹو گرافر یک وقت بولے "ہاں، ہاں تشریف رکھئے "

مبارک نے کہا " سر آنکھوں پر ——— یہاں میرے پاس بیٹھئے ——— آپ تو خود بڑے معرکے کے گانے والے ہیں ——— کچھ نوش فرمائیے گا "

مبارک کی مراد وسکی سے تھی، مگر جنٹل مینوں کے بُرش نے بڑی شائستگی سے کہا۔

"جی نہیں ——— میں اس نعمت سے محروم ہوں "

سب کے اصرار پر اس نے گانا شروع کیا۔ میاں کی ٹوڈی تھی جو اس خوش الحانی سے گائی کہ مزے آ گئے —— اس کے بعد اس نے اجازت چاہی ——

سب نشے میں چور تھے۔ اس لئے ان کو یہ خبر نہیں تھی کہ باہر زوروں کی بارش ہوئی —— لیکن جب جنٹل مینوں کے برش نے دروازہ کھولا تو اس نے کہا ——

"حضور باہر بہت بارش ہو رہی ہے کیسے جائیے گا"

آبنوسی برش کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"آپ فکر نہ کریں ابھی لالہ جگت نارائن کپل والے کی گاڑی مجھے لینے کے لئے آ جائے گی —— آپ اپنا شغل جاری رکھئے —— شکریہ!"

یہ کہکر اس نے دوکان کا پھاٹک نما دروازہ بند کر دیا۔

ایک گھنٹے کے بعد جب بارش تھمی تو محفل برخاست کر دی گئی —— باہر نکل کر ہم نے دیکھا کہ کوئی آدمی بدرو میں اوندھے گرا پڑا ہے —— میں نے غور سے دیکھا تو چلایا ——

"ارے یہ تو وہی جنٹل مینوں کا برش ہے"

حفیظ نے لڑکھڑاتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"جنٹل مینوں کی ایسی تیسی —— چلو اپنے اپنے گھر"

سب نے اس فیصلہ پر صاد کیا۔

جب وہ چلے گئے تو تھوڑی دیر کے بعد وہ شخص جو بے داغ کالی اچکن پہنتا تھا اور روٴسا کے کوٹ صاف کیا کرتا ہے، ہوش میں آیا ——

اس کی اچکن کیچڑ سے اٹی ہوئی ہے، مگر اسے صاف کرنے والا کوئی نہ تھا۔

اولاد

جب زبیدہ کی شادی ہوئی تو اس کی عمر پچیس برس کی تھی۔ اس کے ماں باپ تو یہ چاہتے تھے کہ سترہ برس کے ہوتے ہی اس کا بیاہ ہو جائے مگر کوئی مناسب و موزوں رشتہ ملتا ہی نہیں تھا۔ اگر کسی جگہ بات طے ہونے پاتی تو کوئی ایسی مشکل پیدا ہو جاتی کہ رشتہ عملی صورت اختیار نہ کر سکتا۔

آخر جب زبیدہ پچیس برس کی ہو گئی تو اس کے باپ نے ایک رنڈوے کا رشتہ قبول کر لیا۔ اس کی عمر پینتیس برس کے قریب تھی۔ یا شاید اس سے بھی زیادہ ہو۔ صاحب روزگار تھا۔ مارکیٹ میں کپڑے کی تھوک فروشی کی دوکان تھی۔ ہر ماہ پانچ چھ سو روپے کما لیتا تھا۔

زبیدہ بڑی فرماں بردار لڑکی تھی۔ اس نے اپنے والدین کا فیصلہ منظور کر لیا۔ چنانچہ شادی ہو گئی۔ اور وہ اپنی سسرال چلی گئی۔

اس کا خاوند جس کا نام علیم الدین تھا۔ بہت شریف اور محبت کرنے

والا ثابت ہوا۔ زبیدہ کی ہر آسائش کا خیال رکھتا۔ کپڑے کی کوئی کمی نہیں تھی۔ حالانکہ دوسرے لوگ اس کے لئے ترستے تھے۔ چالیس ہزار اور تھری بی کا لٹھا۔ شیفون اور دو گھوڑے کی بوسکی کے تھانوں کے تھان زبیدہ کے پاس موجود تھے۔

وہ اپنے میکے ہر ہفتے جاتی ـــ ایک دن وہ گئی تو اس نے ڈیوڑھی میں قدم رکھتے ہی بین کرنے کی آواز سُنی۔ اندر گئی تو اسے معلوم ہوا کہ اس کا باپ اچانک دل کی حرکت بند ہونے کے باعث مر گیا ہے۔

اب زبیدہ کی ماں اکیلی رہ گئی تھی۔ گھر میں سوائے ایک نوکر کے اور کوئی بھی نہیں تھا۔ اس نے اپنے خوہر سے درخواست کی کہ وہ اُسے اجازت دے کہ وہ اپنی بیوہ ماں کو اپنے پاس بلا لے۔

علیم الدین نے کہا: "اجازت لینے کی کیا ضرورت تھی ـــ یہ تمہارا گھر ہے۔ اور تمہاری ماں میری ماں ہے ـــ جاؤ انہیں لے آؤ۔ جو سامان وغیرہ ہو گا اس کو یہاں لانے کا بندوبست میں ابھی کئے دیتا ہوں۔"

زبیدہ بہت خوش ہوئی۔ گھر کافی بڑا تھا۔ دو تین کمرے خالی پڑے تھے۔ وہ تانگے میں گئی اور اپنی ماں کو ساتھ لے آئی۔ علیم الدین نے سامان اُٹھوانے کا بندوبست کر دیا تھا۔ چنانچہ وہ بھی پہونچ گیا۔ زبیدہ کی ماں کے لئے کچھ سوچ بچار کے بعد ایک کمرہ مختص کر دیا گیا۔ وہ بہت ممنون و متشکر تھی۔ اپنے داماد کے حسنِ سلوک سے بہت متاثر۔ اس

کے جی میں کئی مرتبہ یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ اپنا سارا زیور جو کئی ہزاروں کی مالیت کا تھا۔ اس کو دے دے کہ وہ اپنے کاروبار میں لگائے اور زیادہ کمائے۔ مگر وہ طبعاً کنجوس تھی۔

ایک دن اس نے اپنی بیٹی سے کہا: "مجھے یہاں آئے دس مہینے ہو گئے ہیں — میں نے اپنی جیب سے ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کیا — حالانکہ تمہارے مرحوم باپ کے چھوڑے ہوئے دس ہزار روپے میرے پاس موجود ہیں — اور زیور الگ — میں نے یہ سب روپے علیم الدین کو دے دیئے ہوتے، مگر میں چاہتی ہوں کہ تمہارے کوئی بچہ پیدا ہو — تو یہ سارا روپیہ اس کو تحفے کے طور پر دوں"

زبیدہ کی ماں کو اس بات کا بڑا خیال تھا کہ ابھی تک بچہ پیدا کیوں نہیں ہوا — شادی ہوئے قریب قریب دو برس ہو چکے تھے، مگر بچے کی پیدائش کے آثار ہی نظر نہیں آتے تھے۔

وہ اسے کئی حکیموں کے پاس لے گئی۔ کئی معجونیں۔ کئی سفوف اور کئی قرص اس کو کھلوائے۔ مگر خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا۔

آخر اس نے پیروں فقیروں سے رجوع کیا۔ ٹونے ٹوٹکے استعمال کئے گئے۔ تعویذ دھاگے بھی — مگر مراد بر نہ آئی۔ زبیدہ اس دوران میں تنگ آ گئی — ایک دن چنانچہ اس نے اکتا کر اپنی ماں سے کہہ ہی دیا۔

"چھوڑو اس قصے کو بچہ نہیں ہوتا تو نہ ہو"

اس کی بوڑھی ماں نے منہ بسور کر کہا: "بیٹا — یہ بہت بڑا قصہ ہے۔ تمہاری عقل کو معلوم نہیں کیا ہو گیا ہے — تم اتنا بھی نہیں سمجھتی ہو کہ اولاد کا ہونا کتنا ضروری ہے — اسی سے تو انسان کی زندگی کا باغ سدا ہرا بھرا رہتا ہے"

زبیدہ نے چھلکا چنگیر میں رکھا: "میں کیا کروں — بچہ پیدا نہیں ہوتا تو اس میں میرا کیا قصور ہے"

بڑھیا نے کہا: "قصور کسی کا بھی نہیں بیٹی — بس صرف ایک اللہ کی مہربانی چاہیئے"

زبیدہ اللہ میاں کے حضور میں ہزاروں مرتبہ دعائیں مانگ چکی تھی کہ وہ اپنے فضل و کرم سے اس کی گود ہری کرے۔ مگر اس کی ان دعاؤں سے کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔

جب اس کی ماں نے ہر روز اس سے بچے کی پیدائش کے متعلق باتیں کرنا شروع کیں، تو اس کو ایسا محسوس ہونے لگا کہ وہ بنجر زمین ہے، جس میں کوئی پودا اُگ ہی نہیں سکتا۔

راتوں کو وہ عجیب عجیب سے خواب دیکھتی۔ بڑے اوٹ پٹانگ قسم کے۔ کبھی یہ دیکھتی کہ وہ لق و دق صحرا میں کھڑی ہے۔ اس کی گود میں ایک گل گوتھنا سا بچہ ہے۔ جسے وہ ہوا میں اتنے زور سے اُچھالتی ہے کہ وہ آسمان تک پہنچ کر غائب ہو جاتا ہے۔

کبھی یہ دیکھتی کہ وہ ایسے بستر میں لیٹی ہے جو ننھے منے بچوں کے

زندہ اور متحرک گوشت سے بنا ہے۔

ایسے خواب دیکھ دیکھ کر اس کا دل و دماغ غیر متوازن ہو گیا — بیٹھے بیٹھے اس کے کانوں میں بچوں کے رونے کی آواز آنے لگتی — اور وہ اپنی ماں سے کہتی۔

"یہ کس کا بچہ رو رہا ہے۔؟"

اس کی ماں نے اپنے کانوں پر زور دے کر یہ آواز سننے کی کوشش کی۔ جب کچھ سنائی نہ دیا تو اس نے کہا "کوئی بچہ رو نہیں رہا۔"

"نہیں ماں — رو رہا ہے — بلکہ رو رو کے ہلکان ہوئے جا رہا ہے۔"

اس کی ماں نے کہا "یا تو میں بہری ہو گئی ہوں، یا تمہارے کان بجنے لگے ہیں۔"

زبیدہ خاموش ہو گئی، لیکن اس کے کانوں میں دیر تک کسی نوزائیدہ بچے کے رونے اور بلکنے کی آوازیں آتی رہیں۔ اور اس کو کئی بار یہ بھی محسوس ہوا کہ اس کی چھاتیوں میں دودھ اتر رہا ہے۔ اس کا ذکر اس نے اپنی ماں سے کیا۔ لیکن جب وہ اندر کمرے میں تھوڑی دیر آرام کرنے کے لئے گئی تو اس نے قمیص اٹھا کر دیکھا کہ اس کی چھاتیاں ابھری ہوئی تھیں۔

بچے کے رونے کی آواز اس کے کانوں میں اکثر ٹپکتی رہی — لیکن وہ اب سمجھ گئی تھی کہ یہ سب واہمہ ہے۔ حقیقت صرف یہ ہے کہ اس کے دل و دماغ پر مسلسل یہ ہتھوڑے پڑتے رہے ہیں کہ اس کے بچہ کیوں نہیں ہوتا — اور وہ خود بھی بڑی شدت سے وہ خلا محسوس کرتی ہے۔ جو کسی بیاہی عورت

کی زندگی میں نہیں ہونا چاہیے۔

وہ اب بہت اداس رہنے لگی۔ محلے میں بچے شور مچاتے تو اس کے کان پھٹنے لگتے۔ اس کا جی چاہتا کہ باہر نکل کر ان سب کا گلا گھونٹ ڈالے۔ اس کے شوہر علیم الدین کو اولاد وولاد کی کوئی فکر نہیں تھی۔ وہ اپنے بیوپار میں مگن تھا۔ کپڑے کے بھاؤ روز بروز چڑھ رہے تھے۔ آدمی چونکہ ہشیار تھا۔ اس نے اس نے کپڑے کا کافی ذخیرہ جمع کر رکھا تھا — اب اس کی ماہانہ آمدن پہلے سے دوگنا ہو گئی تھی۔

مگر اس آمدن کی زیادتی سے زبیدہ کو کوئی خوشی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ جب اس کا شوہر نوٹوں کی گڈی اس کو دیتا، تو وہ اسے اپنی جھولی میں ڈال کر دیر تک انہیں لوری دیتی رہتی — پھر وہ انہیں اٹھا کر کسی خیالی جھولے میں بٹھا دیتی۔

ایک دن علیم الدین نے دیکھا کہ وہ نوٹ جو اس نے اپنی بیوی کو لا کر دیئے تھے۔ دودھ کی پتیلی میں پڑے ہیں۔ وہ بہت حیران ہوا کہ یہ کیسے یہاں پہنچ گئے۔ چنانچہ اس نے زبیدہ سے پوچھا "یہ نوٹ دودھ کی پتیلی میں کس نے ڈالے ہیں؟"

زبیدہ نے جواب دیا "بچے بڑے شریر ہیں، یہ حرکت انہی کی ہوگی۔"

علیم الدین بہت متحیر ہوا "لیکن یہاں بچے کہاں ہیں۔؟"

زبیدہ اپنے خاوند سے کہیں زیادہ متحیر ہوئی "کیا ہمارے ہاں بچے نہیں — آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں — ابھی اسکول سے واپس آتے ہوں گے۔ ان

پوچھوں گی کہ یہ حرکت کس کی تھی۔"

علیم الدین سمجھ گیا۔ کہ اس کی بیوی کے دماغ کا توازن قائم نہیں لیکن اس نے اپنی ساس سے اس کا ذکر نہ کیا۔ کہ وہ بہت کمزور عورت تھی۔

وہ دل ہی دل میں زبیدہ کی دماغی حالت پر افسوس کرتا رہا۔ مگر اس کا علاج اُس کے بس میں نہیں تھا۔ اُس نے اپنے کئی دوستوں سے مشورہ لیا۔ ان میں سے چند نے کہا کہ پاگل خانے میں داخل کرادو۔ مگر اس کے خیال ہی سے اسے وحشت ہوتی تھی۔

اس نے دوکان پر جانا چھوڑ دیا۔ سارا وقت گھر رہتا۔ اور زبیدہ کی دیکھ بھال کرتا کہ مبادا وہ کسی روز کوئی خطرناک حرکت کر بیٹھے۔

اس کے گھر پر ہر وقت موجود رہنے سے زبیدہ کی حالت کسی قدر درست ہوگئی، لیکن اُس کو اس بات کی بہت فکر تھی کہ دوکان کا کاروبار کون چلا رہا ہے۔ کہیں وہ آدمی جس کو یہ کام سپرد کیا گیا ہے غبن تو نہیں کر رہا۔

اُس نے چنانچہ کئی مرتبہ اپنے خاوند سے کہا۔ "دوکان پر تم کیوں نہیں جاتے۔؟" علیم الدین نے اُس سے بڑے پیار کے ساتھ کہا۔ "جانم ـــ میں کام کر کے تھک گیا ہوں۔ اب تھوڑی دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔"

"مگر دوکان کس کے سپرد ہے۔؟"

"میرا نوکر ہے ـــ وہ سب کام کرتا ہے۔"

"کیا ایماندار ہے۔؟"

"ہاں، ہاں بہت ایماندار ہے ـــ دمڑی دمڑی کا حساب دیتا ہے

تم کیوں فکر کرتی ہو۔"

زبیدہ نے بہت متفکر ہو کر کہا۔ "مجھے کیوں فکر نہ ہوگی۔ بال بچے دار ہوں۔ مجھے اپنا تو کچھ خیال نہیں، لیکن اُن کا تو ہے ـــ یہ آپ کا نوکر اگر آپ کا روپیہ مار گیا تو یہ سمجھیے کہ بچوں ــ"

علیم الدین کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ "زبیدہ ـــ اُن کا اللہ مالک ہے۔ ویسے میرا نوکر بہت وفادار ہے اور ایماندار ہے۔ تمہیں کوئی تردد نہیں کرنا چاہیئے۔"

"مجھے تو کسی قسم کا تردد نہیں ہے۔ لیکن بعض اوقات ماں کو اپنی اولاد کے متعلق سوچنا ہی پڑتا ہے۔"

علیم الدین بہت پریشان تھا کہ کیا کرے۔ زبیدہ سارا دن اپنے خیالی بچوں کے کپڑے سیتی رہتی۔ ان کی جرابیں دھوتی۔ اُن کے لئے اونی سوئیٹر بُنتی۔ کئی بار اُس نے اپنے خاوند سے کہہ کر مختلف سائز کی چھوٹی چھوٹی سینڈلیں منگوائیں۔ جن کو وہ ہر صبح پالش کرتی تھی۔

علیم الدین یہ سب کچھ دیکھتا اور اس کا دل رونے لگتا۔ اور وہ سوچتا کہ شاید اُس کے گناہوں کی سزا اُس کو مل رہی ہے۔ یہ گناہ کیا تھے۔ اس کا علم علیم الدین کو نہیں تھا۔

ایک دن اُس کا ایک دوست اُس سے ملا جو بہت پریشان تھا علیم الدین نے اس سے پریشانی کی وجہ دریافت کی تو اس نے بتایا کہ ایک لڑکی حاملہ ہوگئی ہے۔ اسقاط کے تمام ذرائع استعمال کئے گئے ہیں۔ مگر کامیابی نہیں ہوئی۔

علیم الدین نے اس سے کہا۔ "دیکھو اسقاط وسقاط کی کوشش نہ کرو۔ بچہ

پیدا ہونے دو"

اُس کے دوست نے جسے ہونے والے بچّے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ کہا۔

"میں بچّے کا کیا کروں گا؟"

"تم مجھے دیدینا"

بچّہ پیدا ہونے میں کچھ دیر تھی۔ اس دوران میں علیم الدین نے اپنی بیوی زبیدہ کو یقین دلایا کہ وہ حاملہ ہے۔ اور ایک ماہ بعد اُس کے بچّہ پیدا ہو جائیگا۔

زبیدہ بار بار کہتی "مجھے اب زیادہ اولاد نہیں چاہیئے۔ پہلے ہی کیا کم ہے" علیم الدین خاموش رہتا۔

اُس کے دوست کی داشتہ کے لڑکا پیدا ہوا۔ جو علیم الدین نے زبیدہ کے پاس جو کہ سو رہی تھی، لٹا دیا۔ اور اُسے جگا کر کہا "زبیدہ، تم کب تک بے ہوش پڑی رہوگی۔ یہ دیکھو، تمہارے پہلو میں کیا ہے"

زبیدہ نے کروٹ بدلی اور دیکھا کہ اس کے ساتھ ایک ننھا مُنّا بچّہ ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔ علیم الدین نے اس سے کہا "لڑکا ہے۔ اب خدا کے فضل وکرم سے ہمارے پانچ بچّے ہو گئے ہیں"

زبیدہ بہت خوش ہوئی "یہ لڑکا، کب پیدا ہوا۔ ؟"

"صبح سات بجے"

"اور مجھے اس کا علم ہی نہیں — میرا خیال ہے، درد کی وجہ سے میں بیہوش ہو گئی ہوں گی"

علیم الدین نے کہا "ہاں کچھ ایسی ہی بات تھی۔ لیکن اللہ کے فضل وکرم سے

سب ٹھیک ہو گیا"

دوسرے روز جب علیم الدین اپنی بیوی کو دیکھنے گیا۔ تو اُس نے دیکھا کہ وہ لہو لہان ہے اُس کے ہاتھ میں اس کا کٹ تھروٹ اُسترا ہے اور وہ اپنی چھاتیاں کاٹ رہی ہے۔ علیم الدین نے اُس کے ہاتھ سے اُسترا چھین لیا۔

"یہ کیا کر رہی ہو تم۔ ؟"

زبیدہ نے اپنے پہلو میں لیٹے ہوئے بچّے کی طرف دیکھا اور کہا "ساری رات بلکتا رہا ہے۔ لیکن میری چھاتیوں میں دودھ نہ اُترا۔ لعنت ہے ایسی.... اُس سے آگے، وہ اور کچھ نہ کہہ سکی۔ خون سے لتھڑی ہوئی ایک انگلی اُس نے بچّے کے منہ کے ساتھ لگا دی۔ اور ہمیشہ کی نیند سو گئی۔

میرٹھ کی قینچی

"چل چل رے نوجوان" کی ناکامی کا صدمہ ہمارے دل و دماغ سے قریب قریب مندمل ہو چکا تھا۔ گیان مکرجی فلمستان کے لئے ایک پروپیگنڈہ کہانی لکھنے میں ایک عرصے سے معروف تھے۔

کہانی لکھنے لکھانے اور اسے پاس کرانے سے پیشتر نلنی جیونت اور اس کے شوہر ویریندر ڈیسائی (جس سے اب وہ طلاق لے چکی ہے) کنٹریکٹ ہو چکا تھا۔ غالباً پچیس ہزار روپے میں۔ ایک سال اس معاہدے کی میعاد تھی مسٹر ششودھر مکرجی' پروڈکشن کنٹرولر حسبِ عادت سوچ بچار میں دس مہینے گذار چکے تھے۔ کہانی کا ڈھانچہ تھا کہ تیار ہونے میں نہیں آتا تھا۔ بعد مشکل جوں توں کر کے ایک خاکہ معرضِ وجود میں آیا۔ جسے گیان مکرجی اپنے چرمی تھیلے میں ڈال کر دہلی روانہ ہو گئے تاکہ زبانی طور پر اس میں کچھ اور باتیں ڈال کر حکومت سے پاس کرا لیں۔

خاکہ پاس ہو گیا۔ جب شوٹنگ کا مرحلہ آیا تو ویریندر ڈیسائی نے یہ

مطالبہ کیا کہ اس کے ساتھ ایک برس کا اور کنٹریکٹ کیا جائے۔ اس لئے کہ پہلے معاہدے کی میعاد ختم ہو رہی تھی۔ رائے بہادر چونی لال منیجنگ ڈائرکٹر بڑے اکھڑ قسم کے آدمی تھے۔ چنانچہ نتیجہ یہ ہوا کہ مقدمے بازی ہوئی فیصلہ ویریندر ڈیسائی اور اس کی خوبرو بیوی نلنی کے حق میں ہوا۔ اس طرح پراپیگنڈہ فلم جس کی کہانی کا ابھی صرف غیر مکمل خاکہ ہی بنا تھا پچیس ہزار روپوں کے بوجھ تلے آ گئی۔

رائے بہادر کو بہت عجلت تھی کہ فلم جلد تیار ہو۔ کیونکہ بہت وقت ضائع ہو چکا تھا۔ جلدی جلدی ولی صاحب کو بُلا کر ان کی بیوی ممتاز شانتی سے کنٹریکٹ کر لیا گیا اور اس کو چودہ ہزار روپے بطور پیشگی ادا کر دیئے گئے۔ بلیک میں یعنی رسید کے بغیر۔

دو دن شوٹنگ ہوئی' ممتاز شانتی اور اشوک کمار کے درمیان مختصر سا مکالمہ تھا۔ جو بڑی مین میخ کے بعد فلمایا گیا۔ مگر جب پردے پر اس ٹکڑے کو دیکھا گیا تو سب نے ممتاز شانتی کو ناپسند کیا۔ اس ناپسندیدگی میں اس بات کا بڑا دخل تھا کہ ممتاز شانتی برقع پہن کر آتی تھی۔ اور ولی صاحب نے صاف الفاظ میں مکرجی سے کہہ دیا تھا کہ اس کے جسم کو کوئی ہاتھ واتھ نہ لگائے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ممتاز شانتی کو فلم سے علیحدہ کر دیا گیا۔ اس بہانے سے کہ جو کردار اسے ادا کرنا ہے اس کے لئے وہ مناسب و موزوں نہیں۔ کیونکہ ایسے کئی مقام آئیں گے جہاں ہیروئن کو اپنے جسم کے بعض حصّوں کی

نمائش کرنا پڑے گی۔ قصہ مختصر کہ یہ چودہ ہزار بھی گئے۔

اب کہانی کا نامکمل ڈھانچہ انتالیس ہزار روپے کے نیچے دبا پڑا تھا۔ رائے بہادر چونی لال' لال پیلے ہو رہے تھے "چل چل رے نوجوان" کی ناکامی نے کمپنی کی حالت بہت پتلی کر دی تھی۔ مارواڑیوں سے قرض لے کر گزارہ بڑی مشکل سے ہو رہا تھا۔ رائے بہادر کی خفگی اور پریشانی بجا تھی۔

ایک دن میں' واچا' پائی اور اشوک' اسٹڈیو کے باہر کرسیوں پر بیٹھے کمپنی کی ان ہی حماقتوں کا ذکر کر رہے تھے جن کے باعث اتنا وقت اور اتنا روپیہ ضائع ہوا کہ اشوک نے یہ انکشاف کیا کہ جو چودہ ہزار روپے رائے بہادر نے ممتاز شانتی کو دیئے تھے وہ اُنھوں نے اس سے قرض لئے تھے۔ اشوک نے یہ انکشاف اپنی کالی پنڈلی کھُجلاتے ہوئے کچھ اس انداز سے کیا کہ ہم سب بے اختیار ہنس پڑے۔ لیکن فوراً چُپ ہو گئے۔ سامنے بجری بچھی ہوئی روش پر ایک اجنبی عورت ہماری بھاری بھرکم ہیئرڈریسر کے ساتھ میک اپ روم کی طرف جا رہی تھی۔

دتا رام پائی نے اپنے کالے موٹے اور بدشکل ہونٹ کھولے اور خوفناک طور پر آگے بڑھے ہوئے اوندھے سیدھے میلے دانتوں کی نمائش کی' اور واچا کو کہنی کا ٹھوکا دیکر اشوک سے مخاطب ہوا۔

"یہ کون ہے۔۔؟"

واچا نے پائی کے سر پر ایک دھول جمائی "سالے تو کون ہوتا ہے پوچھنے والا۔؟"

پائی بدلہ لینے کے لئے اُٹھا تو واچا نے اس کی کلائی پکڑ لی "بیٹھ جا سالے۔ مت جا ادھر۔ تیری شکل دیکھتے ہی بھاگ جائے گی"

پائی اپنے اوندھے سیدھے دانت پیسا رہ گیا۔ اشوک جو ابھی تک خاموش بیٹھا تھا بولا "گڈ لکنگ ہے"

میں نے ایک لحظے کے لئے غور سے اس عورت کو دیکھا اور کہا "ہاں نظروں پر گراں نہیں گزرتی"

اشوک میرا مطلب نہ سمجھا "کہاں سے نہیں گزرتی۔؟"

میں ہنسا "میرا مطلب یہ تھا کہ جو عورت یہاں سے گذر کر گئی ہے' اسے دیکھ کر آنکھوں پر بوجھ نہیں پڑتا۔ بڑی صاف ستھری۔ لیکن قد کی ذرا چھوٹی ہے"

پائی نے پھر اپنے بدنما دانتوں کی نمائش کی "ارے چلے گی۔ کیوں واچا۔؟"

واچا' پائی کے بجائے اشوک سے مخاطب ہوا "دادا نہی' تم جانتے ہو' یہ کون ہے۔؟"

اشوک نے جواب دیا "زیادہ نہیں جانتا۔ مکرجی سے صرف اتنا معلوم ہوا تھا کہ ایک عوامی ٹسٹ کے لئے آج آنے والی ہے"

کیمرہ اور ساؤنڈ ٹسٹ کیا گیا جسے ہم نے پردے پر دیکھا اور رسماً اپنی اپنی رائے دی۔ مجھے' اشوک اور واچا کو وہ بالکل پسند نہ آئی۔ اس لئے کہ اس کی جسمانی حرکات "چوبی" تھیں۔ اس کے اعضاء کی ہر جنبش میں تصنع

تھا۔ مکالمہ ادا کرتے وقت اس کے ابرو پیشہ ور رقاصاؤں کی طرح ناچتے تھے۔ مسکراہٹ بھی غیر دلکش تھی۔ لیکن پائی اس پر لٹو ہو گیا۔ چنانچہ اس نے کئی مرتبہ اپنے بدنما دانتوں کی نمائش کی اور مکرجی سے کہا: "وونڈرفل اسکرین فیس ہے"

دتا رام پائی فلم ایڈیٹر تھا۔ اپنے کام کا ماہر۔ فلمستان چونکہ ایسا ادارہ ہے جہاں ہر شعبے کے آدمی کو اظہار رائے کی آزادی تھی۔ اس لئے دتا رام پائی وقت بے وقت اپنی رائے سے ہم لوگوں کو مستفید کرتا رہتا تھا۔ اور خاص طور پر میرے تمسخر سے دو چار ہوتا تھا۔

ہم لوگوں نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔ لیکن ایس مکرجی نے اس عورت کو جس کا نام پارو تھا، پراپیگنڈہ فلم کے ایک رول کے لئے منتخب کر لیا۔ چنانچہ رائے بہادر چونی لال نے فوراً اس سے ایک فلم کا کنٹریکٹ معمولی سی ماہانہ تنخواہ پر کر لیا۔

اب پارو ہر روز اسٹوڈیو آنے لگی۔ بہت ہنس مکھ اور گھلو مٹھو ہو جانے والی طوائف تھی۔ میرٹھ اس کا وطن تھا۔ جہاں وہ شہر کے قریب قریب ہر رنگین مزاج رئیس کی منظور نظر تھی۔ اس کو یہ لوگ میرٹھ کی قینچی کہتے تھے۔ اس لئے کہ وہ کاٹتی تھی اور بڑا مہین کاٹتی تھی۔

ہزاروں میں کھیلتی تھی۔ پر اُسے فلموں میں آنے کا شوق تھا جو اسے فلمستان لے آیا۔

جب اس سے کھل کے باتیں کرنے کا موقع ملا تو معلوم ہوا کہ حضرت

جوش ملیح آبادی اور مسٹر ساغر نظامی بھی اکثر اس کے ہاں آیا جایا کرتے تھے اور اس کا مجرا سنتے تھے۔

اس کی زبان بہت صاف تھی اور جلد بھی، جس سے میں بہت متاثر ہوا۔ چھوٹی آستینوں والے پھنسے پھنسے بلاؤز میں اس کی ننگی باہیں ہاتھی کے دانتوں کی طرح دکھائی دیتیں ـــــ سفید، سڈول، متناسب اور خوبصورت جلد میں ایسی چکنی چمک تھی جو "ولو" لکڑی پر رندہ پھیرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ صبح اسٹوڈیو آتی، نہائی دھوئی، صاف ستھری، اُجلی، سفید یا ہلکے رنگ کی ساری میں ملبوس کسی صابن کا اشتہار معلوم ہوتی۔ شام کو جب گھر روانہ ہوتی تو دن گزرنے کے باوجود گرد و غبار کا ایک ذرہ تک اس پہ نظر نہ آتا۔ ویسی ہی تر و تازہ ہوتی، جیسی صبح کو ہوتی۔

دتا رام پائی اس پر اور زیادہ لٹو ہو گیا۔ شوٹنگ شروع نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے اسے فراغت ہی فراغت تھی۔ چنانچہ اکثر پارو کے ساتھ باتیں کرنے میں مشغول رہتا ــــ معلوم نہیں وہ اس کے بھونڈے اور کرخت لہجے اور اس کے اوندھے سیدھے میلے دانتوں اور اُس کے ان کٹے میل بھرے ناخنوں کو کیسے برداشت کرتی تھی ــــ صرف ایک ہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ طوائف اگر برداشت کرنا چاہے تو بہت کچھ برداشت کر سکتی ہے ــ

پروپیگنڈہ فلم کی کہانی کا ڈھانچہ میرے حوالے کیا گیا کہ بڑے غور سے اس کا مطالعہ کروں اور جو ترمیم و تنسیخ میری سمجھ میں آئے بیان کر دوں۔

میں نے اس ڈھانچے کے تمام جوڑ دیکھے اور اس نتیجہ پر پہنچا کر ایسا بے جوڑ ڈھانچہ شاید ہی کسی سے تیار ہو سکے۔ کوئی سرتھا نہ پیر۔ چونکہ میری قابلیت کا امتحان تھا۔ اس لئے میں نے ایک اور ڈھانچہ تیار کیا۔ بڑے خلوص اور بڑی محنت سے۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ ڈائرکشن کے فرائض میرے کہنے پر ساوک واچا کو سونپے جانے والے تھے۔ جو میرا عزیز دوست تھا۔

نیا ڈھانچہ جب فلمستان کی "فل بنچ" کے سامنے پیش ہوا تو میری وہ حالت تھی جو کسی مجرم کی ہو سکتی ہے۔

ایس مکرجی نے اپنا فیصلہ ان چند الفاظ میں دیا: "ٹھیک ہے مگر اس میں ابھی کافی اصلاح کی ضرورت ہے۔"

گیان مکرجی سے پوچھا گیا تو انھوں نے اپنی عادت کے مطابق منہ سکوڑ کر صرف اتنا کہا: "آل موسٹ ٹھیک ہے"

یہ وہ حضرت تھے جو ایس مکرجی کے ڈائرکٹ کئے ہوئے تمام فلموں کے ڈائرکٹر کہلاتے تھے۔ حالانکہ انھوں نے اپنی زندگی میں ایک فٹ فلم بھی ڈائرکٹ نہیں کی تھی۔ اصل میں فلمستان میں کام کرنے کا ڈھنگ ہی نرالا تھا۔ سارا فلم آپ نے ڈائرکٹ کیا ہے۔ لیکن پردے پر میرا نام دیا جا رہا ہے۔ کہانی میری ہے۔ لیکن اس کا مصنف آپ کو بنا دیا گیا ہے۔ بات یہ تھی کہ وہاں سب مل جل کر کام کرتے تھے۔ آپ اس سے اندازہ لگا لیجئے کہ دتا رام جیسے معلوم ہی نہیں تھا کہ فلمی کہانی کیا ہوتی ہے۔ مجھے مشورے دیا کرتا تھا۔

پراپیگنڈہ فلم کی کہانی لکھنے کی دشواریاں وہی سمجھ سکتا ہے جس نے

کبھی ایسی کہانی لکھی ہو۔ سب سے زیادہ مشکل میرے لئے یہ تھی کہ مجھے پارو کو اس کی شکل و صورت۔ اس کے قد اور اس کی فنی کمزوریوں کے پیش نظر اس کہانی میں داخل کرنا تھا۔ بہرحال بڑی مغز پاشیوں کے بعد تمام مراحل طے ہو گئے۔ کہانی کی نوک پلک نکل آئی اور شوٹنگ شروع ہو گئی۔

ہم نے باہم مشورہ کر کے یہ طے کیا کہ جن مناظر میں پارو کا کام ہے وہ سب سے آخر میں فلمائے جائیں تاکہ پارو فلمی فضا سے اور زیادہ مانوس ہو جائے اور اس کے دل و دماغ سے کیمرے کی جھجک نکل جائے۔

کسی منظر کی بھی شوٹنگ ہو، وہ برابر ہمارے درمیان ہوتی، دتا رام پائی اب اس سے اتنا کھل گیا تھا کہ باہم مذاق بھی ہونے لگے تھے۔ پائی کی یہ چھیڑ چھاڑ مجھے بہت بھونڈی معلوم ہوتی۔ میں پارو کی عدم موجودگی میں اس کا تمسخر اڑاتا۔ کمبخت بڑی ڈھٹائی سے کہتا۔

"سالے تو کیوں جلتا ہے"

جیسا کہ میں اس سے پہلے بیان کر چکا ہوں۔ پارو بہت ہنس مکھ اور گھلو مٹھو ہو جانے والی طوائف تھی۔ اسٹوڈیو کے ہر کارکن سے وہ اونچ نیچ سے بے پروا بڑے تپاک سے ملتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بہت تھوڑے عرصہ میں مقبول ہو گئی۔ نچلے طبقے نے اسے احتراماً پارو دیوی کہنا شروع کر دیا۔ یہ اتنا عام ہوا کہ فلم کے عنوانات میں پارو کے بجائے پارو دیوی لکھا گیا۔

دتا رام نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ کچھ ایسی ٹپ لڑائی کہ ایک دن

اس کے گھر پہنچ گیا۔ تھوڑی دیر بیٹھا۔ پارو سے اپنی خاطر مدارات کرائی اور چلا آیا۔ اس کے بعد اس نے ہفتے میں ایک دو مرتبہ باقاعدگی کے ساتھ وہاں جا دھمکنا شروع کر دیا۔

پارو اکیلی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر کا مرد رہتا تھا۔ قد و قامت میں اس سے دوگنا۔ میں نے دو تین مرتبہ اسے پارو کے ساتھ دیکھا۔ —— وہ اس کا پتی دیو کم اور "بھاؤ" زیادہ معلوم ہوتا تھا۔

پائی ایسے فخر و ابتہاج سے کینٹین میں پارو سے اپنی ملاقاتوں کا ذکر نیم عاشقانہ انداز میں کرتا کہ ہنسی آ جاتی۔ میں اور ساوک واچا اس کا خوب مذاق اُڑاتے، مگر وہ کچھ ایسا ڈھیٹ تھا کہ اس پر کچھ اثر نہیں ہوتا تھا۔ کبھی کبھی پارو بھی موجود ہوتی۔ میں اس کی موجودگی میں بھی پائی کے خام اور بھونڈے عشق کا مذاق اُڑاتا۔ پارو برا نہ مانتی اور مسکراتی رہتی۔ اس مسکراہٹ سے اس نے میرٹھ میں جانے کتنے دلوں کو اپنی قینچی سے کترا تھا۔

پارو میں عام طوائفوں ایسا بھڑکیلا یا چھچھورا پن نہیں تھا۔ وہ مہذب محفلوں میں بیٹھ کر بڑی شائستگی سے گفتگو کر سکتی تھی۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ میرٹھ میں اس کے یہاں آنے جانے والے ایرے غیرے نتھو خیرے نہیں ہوتے تھے۔ ان کا تعلق سوسائٹی کے اس طبقے سے تھا جو ناشائستگی کی طرف محض تفریح کی خاطر مائل ہوتا ہے۔

پارو اب اسٹوڈیو کی فضا میں بڑی اچھی خاصی طرح گھل مل گئی تھی۔ فلمی

دنیا میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب کوئی عورت یا لڑکی نئی ایکٹریس بنتی ہے تو اس کو کوئی نہ کوئی دبوچ لیتا ہے۔ جیسے کہ وہ گیند ہے جسے بلّے کے ساتھ کسی نے ہٹ لگائی اور فیلڈ میں کھڑے کھلاڑی اس تاک میں ہیں کہ وہ ان کے ہاتھوں میں چلی آئے۔

لیکن پارو کے ساتھ ایسا نہ ہوا شاید اس لئے کہ فلمستان دوسرے نگار خانوں کے مقابلے میں بہت حد تک "پاکباز" تھا۔ ایک وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ پارو کو اتنی زیادہ جلدی نہیں تھی۔

محسن عبداللہ دیوکا رانی کا سابق خاوند اپنی ایک آہنگ۔ خشک مجرّد زندگی سے اکتا کر پارسی لڑکی ویرا کو جس کی زندگی اسی کی زندگی کی مانند سپاٹ تھی، شریکِ حیات بنانے کی کوشش میں مصروف تھا۔ اسی غرض کے لئے اسے ہمارے ساتھ سیکنڈ کلاس میں سفر کرنا چھوڑنا پڑا۔ کیونکہ ویرا فرسٹ کلاس میں آتی جاتی تھی۔ اس کے بعد اس کو "اپنی کیٹ" کے مطابق آتے جاتے اس کی کتیا کی زنجیر تھامنا پڑتی —— عاشقوں کے امام میاں مجنوں کو بھی تو لیلیٰ کی کُتیا عزیز تھی۔

واچا کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے بڑی مشکلوں کے بعد تازہ تازہ اپنی بدکردار فرانسیسی بیوی سے نجات حاصل کی تھی۔ ایس مکرجی پری چہرہ نسیم بانو کے عشق کے چکر میں تھا۔ گیان مکرجی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کہ وہ ایک عورت سے شادی کر کے ہی بھر پایا تھا ——

اپنے متعلق میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ مجھے پارو کی جلد بہت پسند تھی۔ ایک

دن میں نے شاہد لطیف سے (جو اب فلم ڈائریکٹر اور پروڈیوسر ہے) اس کا ذکر کیا تو اس نے مسکرا کر کہا: "جلد بہت پسند ہے' ٹھیک ہے' لیکن تمہیں کیا معلوم کہ اندر کتاب کیسی ہے' مضمون کیسا ہے۔؟"

پاری کی حالت اب بہت زیادہ مضحکہ خیز ہوگئی تھی۔ اس لئے کہ پاتند نے ایک روز اسے گھر مدعو کیا تھا۔ اور اپنے ہاتھ سے اسے دو پیگ جو نو واکر وسکی کے پلائے تھے۔ جب اس کو بہت زیادہ نشہ ہوگیا تھا۔ تو پارو نے اس کو بڑے پیار سے اپنے صوفے پر لٹا دیا تھا۔ اب اس کو یقین ہوگیا تھا کہ وہ اس پر مرتی ہے۔ اور ہم لوگ چونکہ ناکام رہے ہیں۔ اس لئے حسد کی آگ میں جلتے ہیں۔ اس بارے میں پارو کا ردعمل کیا تھا' یہ مجھے معلوم نہیں۔

شوٹنگ جاری تھی۔ وہ نیا فلم کی ہیروئن تھی۔ سائڈ ہیروئن کا رول پارو کو ادا کرنا تھا۔ اسے بر ملک کے کسی آزاد قبیلے کی ایک شوخ و شنگ' تیز و طرار لڑکی کا روپ دھارنا تھا۔ جوں جوں اس کے مناظر فلمانے جانے کا وقت آتا گیا۔ میرے اندیشے بڑھتے گئے۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ امتحان میں پوری نہیں اترے گی اور ہم سب کی کوفت کا موجب ہوگی۔

آخر وہ دن آگیا' جب اس کا پہلا "شوٹنگ ڈے" تھا۔ میک اپ اور کسٹیوم سے مزین ہو کر جب اسے کیمرے کے سامنے لایا گیا عجیب وغریب تراش کی بھڑکیلے رنگ والی بھنسی بھنسی چولی۔ ناف سے اوپر پیٹ کی ہلکی سی جھلک۔ گھٹنوں سے بالشت بھر اوپر لہنگا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کیمرے' مائک اور خیرہ کن روشنیوں سے قطعاً مرعوب یا خائف نہیں۔ مکالمہ اس کو اچھی طرح یاد کرا دیا گیا تھا۔ اُمید تھی کہ بول جائے گی۔ مگر جب "ٹیک" کا وقت آیا تو اس کا سارا وجود لکڑی ہوگیا۔ منہ کھولا تو مکالمہ سپاٹ۔

کئی ریہرسلیں کرائی گئیں۔ مگر اس لکڑی میں جان کے آثار پیدا نہ ہوئے۔ پیشہ ور رقاصاؤں کی طرح اپنے ابرو نچاتی جیسے بھاؤ بتا رہی ہے۔ تین چار "ری ٹیک" ہوئے تو میں بالکل مایوس ہوگیا۔ واچا طبعاً بہت گھبرا جانے والا ہے۔ اس نے دیکھا کہ اونٹنی کی کوئی کل سیدھی نہیں تو ایس مکرجی سے کہا وہ اسے ٹھیک کرے۔

مکرجی اسے کیا ٹھیک کرتا۔ وہ بنی ہی کچھ ایسے آب و گل سے تھی جس میں بناؤ' بھاؤ اور نرت کوٹ کوٹ کر بھرے تھے۔ چنانچہ ایک "ٹیک" میں اس نے کسی قدر گوارا ایکٹنگ کیا تو مکرجی نے غنیمت سمجھ کر صاد کر دیا۔

ہم سب نے بڑی کوشش کی کہ اس کا تصنع اور "چوبی پن" کسی نہ کسی طریقے سے دور ہو جائے۔ مگر ناکام رہے۔ شوٹنگ جاری رہی اور وہ بالکل نڈر تھی۔ اس کو کیمرے اور مائیک کا کوئی خوف نہیں تھا مگر سیٹ پر وہ حسب منشاء اداکاری کے جوہر دکھانے سے قاصر تھی ـــ اس کی وجہ میرٹھ کے مجروں کے سوا اور کیا ہو سکتی تھی۔ بہر حال اتنی اُمید ضرور تھی کہ وہ کسی نہ کسی روز سمجھ جائے گی۔

چونکہ مجھے اس کی طرف سے بہت مایوسی ہوئی تھی۔ اس لئے میں نے اسے

رول : میں کتر بیونت شروع کر دی تھی۔ میری اس چالاکی کا علم اس کو پائی کے ذریعے سے ہو گیا۔ چنانچہ اس نے خالی اوقات میں میرے پاس آنا شروع کر دیا۔ گھنٹوں بیٹھی اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہتی۔ بڑے شائستہ انداز میں، مناسب و موزوں الفاظ میں جن میں چاپلوسی کا رنگ بظاہر نہ ہوتا میری تعریف کرتی۔

ایک دو مرتبہ اس نے مجھے اپنے گھر پر مدعو بھی کیا۔ میں شاید جاتا لیکن ان دنوں بے حد مصروف تھا۔ ہر وقت میرے اعصاب پر پراپیگنڈہ فلم کا منظر سوار رہتا تھا۔ یوں تو میرا ہاتھ بٹانے کے لئے تین آدمی موجود تھے راجہ مہدی علیخاں، محسن عبداللہ اور ڈکشت۔

راجہ مہدی علی خاں نے تعاون سے صاف انکار کر دیا تھا۔ اس لئے کہ وہ ہر وقت اپنی روٹھی ہوئی بیوی کو خط لکھنے میں مصروف رہتا تھا۔ محسن عبداللہ ویرا سے اپنے تعلقات مستحکم کرنے میں مصروف تھے اور مسٹر ڈکشت پارو کو مکالمے یاد کراتے رہتے تھے۔

میں کچھ عرصے سے نوٹ کر رہا تھا کہ پارو اور اشوک سیٹ پر جب آمنے سامنے آتے ہیں تو اشوک سے پارو کو اپنے جارحانہ عشق کا اظہار کرنا ہوتا ہے تو اس کی آنکھیں اشوک کی آنکھوں میں گڑ جانا چاہتی ہیں۔ جیسے اس کو یہ بتانا مقصود ہے کہ دیکھو یہ جو کچھ ہو رہا ہے۔ جھوٹ نہیں سچ ہے۔

اشوک طبعاً بہت جھینپو قسم کا آدمی ہے۔ وہ کسی عورت سے کھلم کھلا اظہارِ عشق نہیں کر سکتا ــــــــ یہ مجھے معلوم تھا کہ اشوک کو پارو پسند

ہے۔ لیکن اس میں اتنی جرارت نہیں کہ اس سے جسمانی تعلق پیدا کر لیتا۔

اس کی زندگی میں سینکڑوں نہیں ہزاروں لڑکیاں آئیں وہ لارڈ بائرن بن سکتا تھا۔ مگر شرمیلی طبیعت کے باعث ان آسانی سے پھنس جانیوالی تتلیوں کو نا امید کرتا رہا۔

اشوک کمار کا یہ وہ زمانہ تھا جب وہ کسی ایکٹریس پر ہاتھ ڈال سکتا تھا۔ بڑی آسانی سے۔ کئی ایکٹرسیں اپنا دل اس کے قدموں میں پا انداز کی طرح بچھانے کے لئے تیار تھیں۔ میں نے سوچا۔ اگر پارو کے دل میں بھی کھُد بُد ہو رہی ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں ــــــ پھر پارو نو وارد تھی۔ خود کو اشوک کے ساتھ منسلک کر کے وہ بامِ شہرت پر بڑی جلدی پہنچ سکتی تھی۔

فلم میں پارو کا رول ایک آزاد قبیلے کے نیم جنگلی، خود سر اور جارحانہ قسم کا عشق کرنے والی لڑکی کا تھا۔ وہ اشوک سے محبت کرتی تھی۔ مگر وہ ویرا کے عشق میں گرفتار رہتا۔ یہ فلمی تثلیث پارو کے اندرونی جذبات کو مشتعل کرنے کے لئے کافی سامان بہم پہنچا رہی تھی۔

شوٹنگ جاری تھی ــــ ان ڈور۔ آؤٹ ڈور۔ ایک دن کشتیوں کا سین فلمایا جانے والا تھا۔ اس کے لئے بہت دور ایک کھاڑی منتخب کی گئی۔ دو کشتیاں تھیں۔ ایک میں اشوک کمار کو سوار ہونا تھا۔ دوسری میں پارو کو۔ اسے یہ ہدایت تھی کہ جب اس کی کشتی، اشوک کی کشتی کے پاس پہنچے

تو وہ اس میں کود جائے۔

پانی بہت گہرا تھا۔ حسبِ ہدایت پارو' اشوک کی کار کی کشتی میں کود ی۔ مگر ایسا کرتے ہوئے دونوں کشتیوں میں فاصلہ کچھ زیادہ ہوگیا اور وہ پانی میں گر پڑی۔ واچا مدد کے لئے چلایا۔ فوراً ساحل پر سے دو تین مچھیرے پانی کے اندر گھسے اور پارو کو گھسیٹتے ہوئے پانی سے باہر لے آئے۔

عورت زاد' مگر حیرت ہے کہ اس حادثے نے اسے بالکل خوفزدہ نہ کیا۔ کپڑے خشک ہوئے تو وہ دوسرے ٹیک کے لئے تیار تھی۔

جب وہ اپنے بھیگے ہوئے کپڑے نچوڑ رہی تھی تو میں نے اور اشوک نے اس کی ایک ٹانگ کی جھلک دیکھی جو کافی دلچسپ اور خیز تھی۔ جب ہم لوکیشن سے فارغ ہو کر گھر کی طرف روانہ ہوئے تو راستے میں اشوک نے مجھ سے کہا۔

"منٹو! پارو کی ٹانگ بڑی اچھی تھی ۔۔ جی چاہتا تھا' روسٹ بنا کے کھا جاؤں"

عجیب بات ہے کہ اشوک ایسا ڈرپوک اور جھینپو اندرونی طور پر سادیت پسند تھا۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ وہ چونکہ اپنے خیالات دبا دینے کا عادی تھا۔ اس لئے ردِ عمل کی صورت میں یہ سادیت پیدا ہوگئی تھی۔

ٹوسٹہ۔ ایم جی کار میں اشوک اور میں دونوں اسٹوڈیو سے گھر واپس

جایا کرتے۔ اور راستے میں ادھر اُدھر کی مختلف باتیں کیا کرتے تھے۔ موٹر اس سڑک پر سے بھی گذرتی تھی جس ملحقہ گلی میں پارو کا فلیٹ تھا۔ ایک شام جب ہم وہاں سے گذرے تو تھوڑی دور آگے نکل کر اشوک نے موٹر روک لی۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"کیا بات ہے۔؟"

مڑ کر اشوک نے اس گلی کی طرف دیکھا اور کہا "آج ہولی کی خوشی میں پارو نے دعوت دی ہے۔ جاؤں یا نہ جاؤں"

"مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ جاؤ!"

"تو چلو تم بھی چلو"

میں نے کہا "میں کیوں چلوں۔ مجھے اس نے مدعو نہیں کیا"

"کوئی بات نہیں" یہ کہہ کر اس نے تیزی سے موٹر گھمائی۔ اور پارو کے فلیٹ کے پاس بریک لگائی۔ ہارن بجایا تو بالکنی میں واچا اور پارو نمودار ہوئے۔

باتی نے مجھے دیکھا تو اپنے مکروہ دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے بولا۔ "ارے تم بھی آگئے۔؟"

واچا نے اشوک سے کہا "آؤ۔ دادا منی آؤ۔ تمہارا ہی انتظار ہو رہا تھا"

پارو خلافِ معمول پارسی ساڑھی میں ملبوس دُلہن سی بنی بیٹھی تھی۔ ہم کمرے میں داخل ہوئے تو اس نے اٹھ کر استقبال کیا۔ مجھے دیکھ کر اس نے بڑے

مناسب و موزوں الفاظ میں معذرت کی کہ مجھے مدعو کرنا بھول گئی۔

فوراً شراب کا دور شروع ہو گیا۔ پہلا پیگ ختم ہوا تو پانی جھومنے لگا۔ واچا نے فرمائش کی کہ ایک آدھ گانا ہو جائے۔ پارو نے کھانے والی نگاہوں سے اشوک کی طرف دیکھا اور کہا۔

"کیوں اشوک صاحب آپ سنیں گے؟"

اشوک جھینپ گیا اور اپنے مخصوص اکھڑ انداز میں صرف اتنا کہہ سکا۔

"آپ گائیں گی تو میں سنوں گا۔"

گانا شروع ہوا۔ بازاری قسم کی ٹھمری تھی۔ اس کے بعد ایک غزل شروع ہوئی۔ پھر کوئی فلمی گیت۔ اس دوران میں پارو کا شوہر، یا جو کوئی بھی وہ تھا۔ گلاسوں میں شراب اور سوڈا اُنڈیلتا رہا۔ دوسرے پیگ کے بعد پانی کی آنکھیں مُندنے لگیں۔ اشوک زیادہ پینے کا عادی نہیں۔ اس لئے وہ ڈیڑھ پیگ سے آگے نہ بڑھ سکا۔ واچا نے تیسرے کے بعد اپنے گلاس کا منہ بند کر دیا۔

ٹھمریاں، غزلیں، گیت بہت دیر تک ہوتے رہے۔ آخر میں جب اس نے بھجن سنایا تو اس نے میری موجودگی کا احساس کر کے ایک نعت شروع کی۔ لیکن میں نے فوراً اس کو روک دیا۔

"پارو دیوی۔ یہ محفلِ نشاط ہے۔ شراب کے دَور چل رہے ہیں۔ یہاں کالی کملی والے کا ذکر نہ کیا جائے تو اچھا ہے۔"

اس نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور معافی کی طلبگار ہوئی۔

کھانا بہت اچھا تھا ـــــ اشوک جلدی سے فارغ ہو گیا۔ اسکے ہاتھ دُھلوانے کے لئے پارو اُٹھی ـــ جب اشوک واپس آیا تو گھبرایا ہوا تھا۔ جلدی جلدی رخصت چاہی اور مجھے ساتھ لے کر وہاں سے چل دیا۔ راستے میں کوئی بات نہ ہوئی۔ اُس نے مجھے میرے گھر چھوڑا اور چلا گیا۔

کئی دن گزر گئے۔ شوٹنگ بڑی باقاعدگی سے ہو رہی تھی۔ ایک شام جب میں اور اشوک واپس جا رہے تھے تو شیواجی پارک کے پاس جہاں پارو کا فلیٹ تھا، اشوک نے موٹر کی رفتار کم کی اور مجھ سے مخاطب ہوا۔

"منٹو! تمہیں ایک دلچسپ بات بتاؤں؟" اس کے لہجے میں کسی قدر کپکپاہٹ تھی۔

میں نے ایک لمحے کے لئے سوچا کہ یہ دلچسپ بات کیا ہو سکتی ہے۔

"بتاؤ۔"

اشوک ہنسنے لگا "تمہیں یاد ہے اس روز جب ہم پارو کے ہاں کھانا کھا رہے تھے تو وہ میرے ہاتھ دُھلوانے کے لئے اُٹھی تھی۔"

اشوک نے یہ کہا تو مجھے اس کی گھبراہٹ یاد آگئی "ہاں۔ ہاں۔"

"جب غسل خانے میں مجھے اس نے تولیہ دیا تو آہستہ سے کہا۔ کل آپ اکیلے آیئے ـــ شام کو ساڑھے چھ بجے ـــ میں گھبرا گیا اور تولیہ پھینک کر باہر نکل آیا۔"

اس نے موٹر سڑک کے کنارے ٹھیرائی۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"تم گئے ؟"

"ہاں" اشوک نے اسٹیرنگ وہیل سے ہاتھ اٹھائے اور انہیں زور زور سے ملنے لگا "لیکن بھاگ گیا"

میں تفصیل جاننا چاہتا تھا "ہوا کیا ۔ پورا سینریو بتاؤ"

"میں بڑا ڈرپوک ہوں ــــ جانے مجھے ایسے موقعوں پر کیا ہو جاتا ہے ــــ اس نے مجھے صوفے پر بٹھایا ۔ اور آپ قالین پر میرے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی ۔ دو پیگ مجھے پلائے ۔ خود بھی تھوڑی سی پی اور پھر ــــ وہ لگی اپنی محبت جتانے ــــ میں سنتا رہا اور کانپتا رہا ۔ جب اس نے میرا ہاتھ دبایا تو میں نے اسے بڑے زور سے جھٹک دیا ــــ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ۔ لیکن فوراً کہیں غائب ہو گئے ــــ وہ مسکرانے لگی ...... بھیا اشوک ! ــــ میں تو آپ کا امتحان لے رہی تھی ۔ میں نے یہ سنا تو چکرا گیا ۔ اٹھا تو اس نے پھر کہا ۔ اشوک صاحب ! میں تو آپ کو اپنا بھائی سمجھتی ہوں ۔ میں نے کچھ نہ کہا اور نیچے اتر گیا ــــ کار میں بیٹھا ــــ گھر پہنچ کر میں نے آدھا پیگ پی کر سوچا تو مجھے گزرے ہوئے واقعہ پر بہت افسوس ہوا ۔ کیا حرج تھا ۔ اگر میں ...... ؟"

اشوک کے لہجے میں تاسف تھا ۔

میں نے کہا "ہاں کوئی حرج نہیں تھا"

اشوک کے لہجے میں تاسف اور زیادہ ہو گیا ۔

یہ سن کر میرے سامنے وہ منظر آ گیا جو اس واقعہ کے روز رات کے

نو (۹) بجے اسٹوڈیو سے باہر سخت سردی میں فلمایا جا رہا تھا ۔ جشنِ مسرت میں لوگ ناچ رہے تھے ــــ اشوک اپنی ہیروئن ویرا کی باہوں میں باہیں ڈالے محو رقص تھا ۔ اور پارو ایک طرف مجسمہ افسردگی بنی اکیلی کھڑی تھی ۔

Good

شکاری عورتیں!

میں آج آپ کو چند شکاری عورتوں کے قصے سناؤں گا۔ میرا خیال ہے کہ آپ کو بھی کبھی ان سے واسطہ پڑا ہو گا۔

میں بمبئی میں تھا۔ فلمستان سے عام طور پر برقی ٹرین سے چھ بجے گھر پہنچ جایا کرتا تھا۔ لیکن اس روز مجھے دیر ہو گئی۔ اس لئے کہ "شکاری" کی کہانی پر بحث مباحثہ ہوتا رہا۔

میں جب بمبے سنٹرل کے اسٹیشن پر اُترا۔ تو میں نے ایک لڑکی کو دیکھا۔ جو تھرڈ کلاس کمپارٹمنٹ سے باہر نکل گئی۔ اس کا رنگ گہرا سانولا تھا۔ ناک نقشہ ٹھیک تھا۔ جوان تھی۔ اس کی چال بڑی اوکھی سی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ فلم کا منظر نامہ لکھ رہی ہے۔

میں اسٹیشن سے باہر آیا اور پُل پر وکٹوریا گاڑی کا انتظار کرنے لگا۔ میں تیز چلنے کا عادی ہوں۔ اس لئے میں دوسرے مسافروں سے بہت پہلے باہر نکل آیا تھا۔

وکٹوریہ آئی اور میں اس میں بیٹھ گیا۔ میں نے کوچوان سے کہا کہ آہستہ آہستہ چلے۔ اس لئے کہ فلمستان میں کہانی پر بحث کرتے کرتے میری طبیعت مکدر ہو گئی تھی۔ موسم خوشگوار تھا۔ وکٹوریہ والا آہستہ آہستہ پُل پر سے اُترنے لگا۔

جب ہم سیدھی سڑک پر پہونچے تو ایک آدمی سر پر ٹاٹ سے ڈھکا ہوا مٹکا اُٹھائے صدا لگا رہا تھا: "قلفی — قلفی"

جانے کیوں میں نے کوچوان سے وکٹوریہ روک لینے کے لئے کہا۔ اور اس قلفی بیچنے والے سے کہا کہ ایک قلفی دو — میں اصل میں اپنی طبیعت کا تکدر کسی نہ کسی طرح دور کرنا چاہتا تھا۔

اس نے مجھے ایک دونے میں قلفی دی، میں کھانے ہی والا تھا کہ اچانک کوئی دھم سے وکٹوریہ میں آن گھسا۔ کافی اندھیرا تھا۔ میں نے دیکھا تو وہی گہرے رنگ کی سانولی لڑکی تھی۔

میں بہت گھبرایا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ دونے میں میری قلفی پگھلنا شروع ہو گئی۔

اس نے قلفی والے سے بڑے بے تکلف انداز میں کہا: "ایک مجھے بھی دو"

اس نے دیدی۔ گہرے سانولے رنگ کی لڑکی نے اسے ایک منٹ میں چٹ کر دیا۔ اور وکٹوریہ والے سے کہا۔

"چلو"

میں نے اس سے پوچھا "کہاں۔؟"

"جہاں بھی تم چاہتے ہو۔؟"

"مجھے تو اپنے گھر جانا ہے"

"تو گھر ہی چلو"

"تم ہو کون؟"

"کتنے بھولے بنتے ہو"

میں سمجھ گیا کہ وہ کس قماش کی لڑکی ہے، چنانچہ میں نے اس سے کہا۔

"گھر جانا ٹھیک نہیں ــــ اور یہ وکٹوریہ بھی غلط ہے ــ کوئی ٹیکسی لے لیتے ہیں"

وہ میرے اس مشورے پر بہت خوش ہوئی ــــ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس سے نجات کیسے حاصل کروں ــ اسے دھکا دیکر باہر نکال تو دوں مگر پھر میں نے یہ بھی سوچا کہ عورت ذات ہے۔ اس سے فائدہ اُٹھا کر کہیں وہ یہ واویلا نہ مچادے کہ میں نے اس سے ناشائستہ مذاق کیا ہے۔

وکٹوریہ چلتی رہی اور میں سوچتا رہا کہ یہ مصیبت کیسے ٹل سکتی ہے۔ آخر ہم جے جی ہسپتال کے پاس پہونچ گئے۔ وہاں ٹیکسیوں کا اڈہ تھا۔ میں نے وکٹوریہ والے کو اس کا کرایہ ادا کیا۔ اور ایک ٹیکسی لے لی۔ ہم دونوں اس میں بیٹھ گئے ــــ ڈرائیور نے پوچھا "کدھر جانا ہے صاحب۔؟"

میں اگلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد میں نے اس سے زیرِ لب

کہا "مجھے کہیں بھی نہیں جانا ہے ــــ یہ لو دس روپے۔ اس لڑکی کو تم جہاں بھی لے جانا چاہو لے جاؤ" وہ بہت خوش ہوا۔ دوسرے موڑ پر اس نے گاڑی ٹھیرائی اور مجھ سے کہا۔

"صاحب آپکو سگریٹ لینے تھے۔ اس ایرانی کے ہوٹل سے سستے مل جائینگے"

میں فوراً دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ گہرے رنگ کی لڑکی نے کہا "دو پیکٹ لانا" ڈرائیور اس سے مخاطب ہوا "تین لے آئیں گے اور اس نے موٹر اسٹارٹ کی اور یہ جا وہ جا۔

بمبئی ہی کا واقعہ ہے۔ میں نے اپنے فلیٹ میں اکیلا بیٹھا تھا۔ میری بیوی شاپنگ کے لئے گئی ہوئی تھی۔ کہ ایک گھاٹن جو بڑے تیکھے نقشوں والی تھی۔ بے دھڑک اندر چلی آئی۔ میں نے سوچا شاید نوکری کی تلاش میں آئی ہے مگر وہ آتے ہی کرسی پر بیٹھ گئی ــــ میرے سگریٹ کیس سے ایک سگریٹ نکالا اور اسے سلگا کر مسکرانے لگی۔

میں نے اس سے پوچھا "کون ہو تم۔؟"

"تم پہچانتے نہیں"

"میں نے آج پہلی دفعہ تمہیں دیکھا ہے"

"سالا جھوٹ مت بولو۔ تم روز دیکھتا ہے"

میں بڑی الجھن میں گرفتار ہو گیا۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد میرا نوکر

فضل دین آگیا۔ اس نے اس تیکھے نقشوں والی گھاٹن کو اپنی تحویل میں لیا۔

یہ واقعہ لاہور کا ہے۔

میں اور میرا ایک دوست ریڈیو اسٹیشن جا رہے تھے۔ جب ہمارا تانگہ اسمبلی ہال کے پاس پہنچا تو ایک تانگہ ہمارے عقب سے نکل کر آگے آگیا اس میں ایک برقعہ پوش عورت تھی جس کی نقاب نیم وا تھی۔

میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں عجیب قسم کی شرارت ناچنے لگی۔ میں نے اپنے دوست سے جو پچھلی نشست پر بیٹھا تھا کہا "یہ عورت بدچلن معلوم ہوتی ہے۔"

"تم ایسے فیصلے ایک دم مت دیا کرو۔"

"بہت اچھا جناب۔ میں آئندہ احتیاط سے کام لوں گا۔"

برقعہ پوش عورت کا تانگہ ہمارے تانگے کے آگے آگے تھا۔ وہ ٹکٹکی لگائے ہمیں دیکھ رہی تھی۔ میں بڑا بزدل ہوں۔ لیکن اس وقت مجھے شرارت سوجھی اور میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے آداب عرض کر دیا۔

اس کے ادھ ڈھکے چہرے پر مجھے کوئی ردِ عمل نظر نہ آیا۔ جس سے مجھے بڑی مایوسی ہوئی۔

میرا دوست گھٹنے لگا۔ اس کو میری اس ناکامی سے بڑی مسرت ہوئی لیکن جب ہمارا تانگہ شملہ پہاڑی کے پاس پہنچ رہا تھا تو برقعہ پوش عورت نے

اپنا تانگہ ٹھیرا لیا۔ اور (میں زیادہ تفصیل میں نہیں جانا چاہتا) وہ نیم اٹھی ہوئی نقاب کے اندر مسکراتی ہوئی آئی اور ہمارے تانگے میں بیٹھ گئی۔ میرے دوست کے ساتھ۔ میری سمجھ میں نہ آیا کیا کیا جائے۔ میں نے اس برقعہ پوش عورت سے کوئی بات نہ کی۔ اور تانگے والے سے کہا کہ وہ ریڈیو اسٹیشن کا رُخ کرے۔

میں اسے اندر لے گیا۔ ڈائرکٹر صاحب سے میرے دوستانہ مراسم تھے میں نے ان سے کہا "یہ خاتون ہمیں رستے میں پڑی ہوئی مل گئی۔ آپ کے پاس لے آیا ہوں اور درخواست کرتا ہوں کہ انہیں کوئی کام دلوا دیجیے۔"

انھوں نے اس کی آواز کا امتحان کرایا جو کافی اطمینان بخش تھا۔ جب وہ آڈیشن دے کر باہر آئی تو اُس نے بُرقعہ اُتارا ہوا تھا۔ میں نے اسے غور سے دیکھا۔ اس کی عمر پچیس کے قریب ہوگی۔ رنگ گورا، آنکھیں بڑی بڑی لیکن اس کا جسم ایسا معلوم ہوتا تھا۔ شکر قندی کی طرح بھوبل میں ڈال کر باہر نکالا گیا ہے۔

ہم باتیں کر رہے تھے کہ اتنے میں چپڑاسی آیا۔ اس نے کہا کہ باہر ایک تانگہ والا کھڑا ہے۔ وہ کرایہ مانگتا ہے۔ میں نے سوچا شاید زیادہ عرصہ گذرنے پر وہ تنگ آگیا ہے۔ چنانچہ میں باہر نکلا۔ میں نے اپنے تانگے والے سے پوچھا "بھی کیا بات ہے، ہم کہیں بھاگ تو نہیں گئے۔"

وہ بڑا حیران ہوا "کیا بات ہے سرکار۔؟"

"تم نے کہلا بھیجا ہے کہ میرا کرایہ ادا کرو۔"

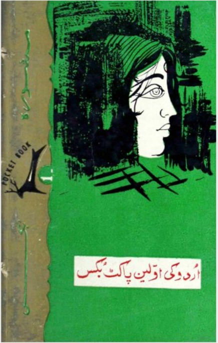

اپنا تانگہ ٹھیرالیا۔ اور (میں زیادہ تفصیل میں نہیں جانا چاہتا) وہ نیم اُٹھی ہوئی نقاب کے اندر مسکراتی ہوئی آئی اور ہمارے تانگے میں بیٹھ گئی۔ میرے دوست کے ساتھ۔ میری سمجھ میں نہ آیا کیا کیا جائے۔ میں نے اس برقعہ پوش عورت سے کوئی بات نہ کی۔ اور تانگے والے سے کہا کہ وہ ریڈیو اسٹیشن کا رُخ کرے۔

میں اسے اندر لے گیا۔ ڈائرکٹر صاحب سے میرے دوستانہ مراسم تھے میں نے ان سے کہا "یہ خاتون ہمیں رستے میں پڑی ہوئی مل گئی۔ آپ کے پاس لے آیا ہوں اور درخواست کرتا ہوں کہ انہیں کوئی کام دلوا دیجئے۔"

انھوں نے اس کی آواز کا امتحان کرایا جو کافی اطمینان بخش تھا۔ جب وہ آڈیشن دے کر باہر آئی تو اُس نے برقعہ اُتار رکھا تھا۔ میں نے اسے غور سے دیکھا۔ اس کی عمر پچیس کے قریب ہوگی۔ رنگ گورا، آنکھیں بڑی بڑی لیکن اس کا جسم ایسا معلوم ہوتا تھا، شکر قندی کی طرح بھوبل میں ڈال کر باہر نکالا گیا ہے۔

ہم باتیں کر رہے تھے کہ اتنے میں چپڑاسی آیا۔ اس نے کہا کہ باہر ایک تانگہ والا کھڑا ہے۔ وہ کرایہ مانگتا ہے۔ میں نے سوچا شاید زیادہ عرصہ گذرنے پر وہ تنگ آگیا ہے۔ چنانچہ میں باہر نکلا۔ میں نے اپنے تانگے والے سے پوچھا "بھئی کیا بات ہے، ہم کہیں بھاگ تو نہیں گئے؟"

وہ بڑا حیران ہوا "کیا بات ہے سرکار۔۔؟"

"تم نے کہلا بھیجا ہے کہ میرا کرایہ ادا کرو"